ISSN: 2581-5482

سہ ماہی

ادبی نشیمن

ستمبر تا نومبر ۲۰۲۲ء

Adbee Nasheman

#Cover Page Painting credit to S.H.Sunbul

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد

قیمت: ۲۵/روپے

آزادی کے ۷۵ سال

آزادی کا امرت مہوتسو



اتر پردیش اردو اکادمی کی اسکیمیں

اردو طلبا کو وظائف ☆صوبے کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں/ دارالمطالعوں کو مالی امداد ☆ اردو ادباء کو مجموعی ادبی خدمات اور اردو اکتب پر انعامات ☆مسودات کی طباعت کے لئے مالی امداد ☆مصنفین کو ماہانہ امداد☆اردو کتابت اسکول ☆ اردو کو چنگ سینٹر ☆ اردو کمپیوٹر سینٹر☆اردو کی مطبوعات کی فروخت ☆ سہ ماہی "اکادمی" اور ماہنامہ "خبرنامہ" کی اشاعت ☆ سیمنار، سمپوزیم اور مشاعروں کا انعقاد ☆ اقلیتی طلباء کو سول سروسز کی کو چنگ کے لئے اردو آئی۔اے۔ایس اسٹڈی سینٹر پارہ، موہان روڈ، لکھنؤ☆ بچوں کا رسالہ "باغیچہ" کی اشاعت، اردو ماس کمیونیکشن اینڈ میڈیا سینٹر، واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ۔

اتر پردیش اردو اکادمی کی اہم مطبوعات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت		نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت
۱۔	ساغر خیامی	ناشر نقوی	250/=		۲۱۔	تنقیدی نظریات (دوم)	سید احتشام حسین	52/=
۲۔	مظہر امام	امام اعظم	208/=		۲۲۔	توبۃ النصوح	ڈپٹی نذیر احمد	92/=
۳۔	انتقار شناسی	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	270/=		۲۳۔	گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ	عشرت علی صدیقی	107/=
۴۔	پیغام آفاقی	خان محمد آصف	224/=		۲۴۔	ابن الوقت	ڈپٹی نذیر احمد	126/=
۵۔	سالک لکھنوی	پروفیسر منظر حنفی	216/=		۲۵۔	بادشاہ نصیر الدین حیدر	مرزا وجاہت حسین	42/=
۶۔	متین طارق باغپتی	ڈاکٹر ذکی طارق	216/=		۲۶۔	مقالات یوم نگم	اتر پردیش اردو اکادمی	5/=
۷۔	پروفیسر قمر رئیس	پروفیسر تو قیر احمد خاں	245/=		۲۷۔	نانک ساگر	نور الٰہی و محمد عمر	163/=
۸۔	ڈاکٹر اسعد بدایونی	حسیب سوز	245/=		۲۸۔	نو آئین ہندی	سید سلیمان حسین	12/=
۹۔	حفیظ میرٹھی	ڈاکٹر تابش مہدی	245/=		۲۹۔	ہم قبیلہ	علی جواد زیدی	22/=
۱۰۔	عابد سہیل	ڈاکٹر صبیحہ انور	245/=		۳۰۔	ہندوستانی تہذیب	اقبال حسین	30/=
۱۱۔	جوگیندر پال	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	287/=		۳۱۔	رسالہ زمانہ	خورشید افسر بسوانی	22/=
۱۲۔	تعلیم نسواں	نسرین احمد	170/=		۳۲۔	عصمت شناسی	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	248/=
۱۳۔	معیاری نثر و نظم (اول)	حامد ندیم	73/=		۳۳۔	ادب پارے نثر	سید احتشام حسین	45/=
۱۴۔	معیاری نثر و نظم (دوم)	حامد ندیم	85/=		۳۴۔	ادب پارے نظم	سید احتشام حسین	45/=
۱۵۔	مثنوی سحر البیان	میر حسن	108/=		۳۵۔	منتخب غزلیں	مجلس مشاورت	65/=
۱۶۔	مثنوی گلزار نسیم	دیا شنکر نسیم	70/=		۳۶۔	منتخب نظمیں	مجلس مشاورت	60/=
۱۷۔	اعتبار نظر	سید احتشام حسین	105/=		۳۷۔	ملک زادہ منظور احمد	انور جلال پوری	263/=
۱۸۔	انیسیات	سید مسعود حسین رضوی	91/=		۳۸۔	کلیم عاجز	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	173/=
۱۹۔	پریم چند نئے تناظر میں	پروفیسر علی احمد فاطمی	80/=		۳۹۔	ندا فاضلی نمبر	پروفیسر علی احمد فاطمی	278/=
۲۰۔	تنقیدی نظریات (اول)	سید حتشام حسین	58/=		۴۰۔	سید حامد	ڈاکٹر عبید اقبال عاصم	140/=

اکادمی کی مطبوعات کی خریداری و دیگر تفصیلات کے لئے رابطہ کریں:

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ۔226010

فون نمبر:0522-4022924 سیلس ڈپو موبائل:7081007078

E-mail:upurduakademi3@gmail.com

ستمبر تا نومبر
۲۰۲۲ء
ISSN: 2581-5482
جلد : ۵
شمارہ: ۴

سہ ماہی

ادبی نشیمن

ایڈیٹر
ڈاکٹر سلیم احمد
Mob: 8707260591, 9415693119
saleemahmad110@gmail.com
adbeenasheman@gmail.com

معاون ایڈیٹر
شاہد حبیب
Mob: 8539054888
shahidhabib10@gmail.com

ادبی مشیر
رفعت عزمی
Mob: 9451818310
rafatsafavi@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر غلام حسین (اجین) — ڈاکٹر رضی الرحمٰن (گورکھپور)
ڈاکٹر مجاہد الاسلام (لکھنؤ) — ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی
ڈاکٹر شکیل احمد (مئو) — وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)

تزئین کار: عبدالسمیع قاسمی (Mob:9335737053)

ادبی نشیمن میں شائع ہونے والے تمام مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے اس کی ساری ذمہ داری مصنف کی ہوگی۔ ادارے کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔

ADABI NASHEMAN

قیمت

فی شمارہ	:	۴۵/روپئے
دوسالہ ممبرشپ مع رجسٹرڈ ڈاک	:	۳۰۰/روپئے
بیرونی ممالک (ہوائی جہاز ڈاک)	:	$15 (امریکی ڈالر)
لائف ٹائم ممبرشپ	:	پانچ ہزار روپئے
لائبریری/ادارہ کے لئے	:	۶۵/روپئے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ
سہ ماہی ادبی نشیمن
168/C-544 الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ

Bank Detail

Name : Adbee Nasheman
Bank : Indian Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No : 50489096237
IFSC : IDIB000L558

Address

Editor Urdu Quarterly
ADABI NASHEMAN
544-C/168,Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03
www.adbeenasheman.com
adbeenasheman@gmail.com

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارودخانہ، گولہ گنج لکھنؤ سے چھپوا کر 168/544-e، الماس باغ ہردوئی روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

فہرست عنوانات

آغاز

۱	حمد	ڈاکٹر مخمور کاکوروی	۳
۲	نعت	سید محمد نورالحسن نور نوابی	۳

اداریہ

۳	نظریہ	ایڈیٹر	۴

مضامین

۴	شبلی شناسی کے گل سرسبد: مولانا سید سلیمان ندوی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۵
۵	اردو تحقیق وتنقید کی ترقی میں حسرتؔ کا کردار: ایک تحقیقی جائزہ	ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری	۱۴
۶	کئی چاند تھے سرِ آسماں: ایک نفسیاتی جائزہ	ڈاکٹر معراج الدین خاں	۲۰
۷	امیر خسرو کی پہچان	ڈاکٹر ذاکر حسین ذاکر	۲۷
۸	منظومات شبلی: ایک مطالعہ	قمر الزماں صدیقی	۳۲
۹	منور رانا: غزل میں ماں کی نغمہ سرائی کرنے والا شاعر	ایس معشوق احمد	۳۶
۱۰	عبدالحئی پیامؔ انصاری: ایک تاثر	ڈاکٹر شکیل احمد	۴۱
۱۱	ادب اطفال کے فروغ میں متین اچل پوری کا حصہ	حُسین قریشی	۴۵
۱۲	ڈاکٹر احسان عالم کا فن: ''بچوں کے سنگ'' کی روشنی میں	ڈاکٹر ریحان احمد قادری	۴۸

غزلیات

۱۳	غزلیں	محبوب خان اصغرؔ / مرغوب اثرؔ فاطمی / اصغر شمیمؔ	۵۴
۱۴	غزلیں / سانیٹ	ایم۔ایچ تابش ردولوی / ذکی طارق بارہ بنکوی / ڈاکٹر رؤف خیر	۵۵
۱۵	نظمیں	شعیب ندیم گورکھپوری / پرویز ادیب کان پوری	۵۶
۱۶	قطعات	مصداق اعظمی	۵۷

افسانہ

۱۷	بہروپئے	اشتیاق سعید	۵۸
۱۸	زندگی اک قوس وقزح	ذوالفقار علی بخاری	۶۰

تبصرے

۱۹	خواتین ادب: تاریخ وتنقید از۔ صالحہ صدیقی	مبصر: ضیاء العظیم	۶۳
۲۱	**مراسلہ**	قائد حسین کوثر	۶۴

حمدِ باری تعالیٰ

ڈاکٹر مخمور کاکوروی
Mob. 9450097929

نظامِ شمس و قمر وسعتِ فلک تیری
تمام عالمِ امکاں میں ہے مہک تیری

یہ انس و جن ، یہ چرند و پرند، وحش و طیور
ہمیشہ کرتے ہیں حمد و ثنا ملک تیری

وہ خود نہ تابِ نظارہ پہ رکھ سکے قابو
جو دیکھی طور پہ موسیٰ نے اک جھلک تیری

بڑھا جو ابرہہ مسمار کرنے کعبہ کو
بچانے آئی ابابیلوں کی کمک تیری

شعور بخشا ہے تو نے ہی تلخ و شیریں کا
زبان تیری عطا ، لذتِ نمک تیری

ترے ہی قبضۂ قدرت میں ہے نظامِ جہاں
گلوں میں خوشبو تری ،شاخوں میں لچک تیری

جھکا ہے در پہ ترے اس لیے سرِ مخمور
جبینِ سجدہ پہ آجائے کچھ چمک تیری

☆☆☆

نعتِ پاک

سید محمد نور الحسن نور نوابی
قاضی پور شریف

ہر اوج کا سر جھکتا ہے شاہا ترے آگے
کوئی بھی تو لگتا نہیں اونچا ترے آگے

تو سید کونین ہے، تو رحمت کل ہے
سلطان زمانہ بھی ہے منگتا ترے آگے

ہر قوت باطل کو ہلادے تری ہیبت
ہیں لرزہ بدن قیصر و کسریٰ ترے آگے

اے ابر کرم! شمع حرم! جانِ دو عالم!
سکہ نہ چلا اور کسی کا ترے آگے

ہاتھ آئے اگر دولت کونین تو وہ بھی
کردوں گا نچھاور مرے مولا ترے آگے

انصار سے پوچھے کوئی ہجرت تری کیا ہے
پلکوں سے بچھا سارا مدینہ ترے آگے

سلطانیِ عالم بھی کوئی چیز نہیں ہے
اے دولت عشق شہ بطحا ترے آگے

بس کاسۂ دل رکھ دیا داتا ترے در پر
لب کھولنا اچھا نہیں لگتا ترے آگے

ہے شہر ترا دور مرے گھر سے یہ مانا
دشوار ہے کیا گھر مرے آنا ترے آگے

تو ان کی غلامی کی سند کر لے جو حاصل
رکھ دے گی جبیں دولت عقبیٰ ترے آگے

معراج تری ہے مرے ادراک سے باہر
معراج مری، خاک میں ملنا ترے آگے

ہوگا نہ کبھی تیرے کرم کو یہ گوارا
ہو نور ترا حشر میں رسوا ترے آگے

☆☆☆

اداریہ



قارئین اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ آج کے ماحول میں اردو کا رسالہ نکالنا کس قدر مشکل ہے، یہ جوئے شیر لانے سے کسی طور کم نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہم تیشۂ فرہاد لے کر ایک بار پھر "ادبی نشیمن" کے تازہ شمارے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ کوئی بھی رسالہ ہو یا اخبار، اس کی اشاعت اور آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اشتہار ہی ہوتا ہے اور اس میں سرکاری اشتہاروں کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ لیکن گزشتہ کئی سالوں سے اردو رسائل واخبارات سرکاری اشتہاروں کے حصول کے لیے ایک نوع کی نبرد آزمائی میں مبتلا ہیں۔ اس صورتحال کے باوجود یہ بات صرف نجی رسائل واخبارات پر نافذ ہوتی ہے، سرکاری رسائل کو اس نبرد آزمائی سے چھوٹ حاصل ہے۔ اس نوع کے رسائل میں "آج کل" اور "نیا دور" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ "آج کل" کا تو تقریباً ۸۰ برس کی شاندار تاریخ ہے اور "نیا دور" تقریباً ۶۵ برس کا طویل سفر طے کرنے کے بعد اپنے مدیران اور ذمہ داران کی نااہلی کی بنا پر دم توڑنے کے کگار پر ہے۔ حالانکہ ان رسائل کو نہ تو سرکاری اشتہارات کی ضرورت رہی ہے اور نہ ہی یہ خریداروں کے محتاج ہوتے ہیں اور پھر یہ نجی رسائل کے مقابلے میں بہت کم قیمت پر دستیاب بھی ہوتے ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے لئے سرکار کی طرف سے خطیر رقم مختص ہوا کرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک خبر تیزی سے گردش کر رہی ہے کہ "معیار" کی ضمانت مانا جانے والا اردو کا مشہور رسالہ "آجکل" خریداروں کی کم ہوتی تعداد کی وجہ سے بند ہونے کے قریب ہے۔ چونکہ اس رسالے کو اس کے ذمہ داران نے "معیار" کی سند دے رکھی تھی، اس لئے غیر معروف تخلیق کاروں کو اس میں بہت کم جگہ ملی۔ اور پھر اس کے ارباب مجاز نے کبھی توسیع اشاعت کی مہم بھی نہیں چلائی۔ اس لیے اس رسالے کو آج یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔ بہر کیف حالات بہت نازک ہیں۔ اس لیے گلے شکوے بھلا کر اس رسالے کو بند ہونے سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یونیورسٹیز اور کالجوں کے اساتذہ اور وظیفہ خوار ریسرچ اسکالرس "آجکل" کے قارئین کی تعداد میں اضافہ کرنے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ رسالہ بند ہونے کی صورت میں نہ تو مدیر کی تنخواہ میں کوئی کمی ہوگی اور نہ ہی ذمہ داروں یا عملے کی نوکری پر اس کا کوئی منفی اثر پڑنے والا ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے "نیا دور" کے گذشتہ کئی برسوں سے شائع نہ ہونے کے باوجود مدیر، ذمہ داران اور عملے کی نہ تو تنخواہ میں تخفیف ہوئی اور نہ ہی نوکری پر اس کا کوئی اثر پڑا۔ یہاں پر ایک بات واضح کر دوں کہ یہ کہنا کہ خریداروں کی کم ہوتی تعداد کی وجہ سے رسالہ بند ہونے کے قریب ہے، یہ بات ہرگز درست معلوم نہیں ہوتی کیوں کہ یہ سرکاری رسائل ہیں اور سرکاری رسائل کے بند ہونے کی وجہ صرف اور صرف ذمہ داروں کی نااہلی اور من مانی ہوتی ہے اور من مانی کہیں بھی ہو وہ نقصاندہ ہی ہوتی ہے۔ خریدار کم ہونے کی بات تو محض ایک بہانہ ہے۔ این سی پی یو ایل ماہنامہ "اردو دنیا" سمیت خواتین، ادب اطفال اور تحقیق کے ضمن کے مختلف رسالے شائع کر رہی ہے، اردو اکادمی، دہلی بھی ماہنامہ "ایوان اردو" اور ماہنامہ "امنگ" جیسے رسائل کی اشاعت مسلسل جاری رکھے ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے رسائل ہیں جو پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں اور انھیں خریدار بھی مل رہے ہیں، ایسے میں صرف "آجکل" کو ہی کیوں خریدار کے نہ ملنے کی شکایت ہو سکتی ہے بھلا۔ اس لیے مسئلے کی جڑ کو کہیں اور تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ بہر حال رسالے کے بند ہونے کی صورت میں اردو ادب کا بڑا خسارہ ضرور ہوگا۔ لہٰذا تمام اہل قلم، اہل علم اور محبان اردو سے خصوصی اپیل ہے کہ ماہنامہ "آجکل" کو اس زوال آمادہ فضا سے نکالنے میں ہنگامی طور پر تعاون کریں، ساتھ ہی ایڈیٹوریل بورڈ اور دیگر ذمہ داران اپنی پالیسی میں نرمی اختیار کریں اور قارئین کی تعداد میں اضافے کی مہم چلائیں۔ کیوں کہ اس رسالے نے اب تک اردو ادب کی جو خدمت انجام دی ہے اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ لہٰذا اس رسالے کے وجود کو بچانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں اردو تنظیموں اور محبان اردو کو حکومت اور متعلقہ اداروں کو میمورنڈم ارسال کرتے ہوئے آگاہ کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی ان کوششوں کی اشاعت اخبارات میں بھی کرائی جانی چاہئے تاکہ با اثر طریقے سے دور تک اس کی آواز پہنچے۔

افسوس ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ اردو تہذیب کا دم بھرنے والے ہی وقت پر اردو کا علم اٹھانے سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اردو کی روٹی کھانے والے ہی جب اردو کے ساتھ بے وفائی پر اتر آئیں گے تو پھر کس سے امید رکھی جائے گی۔ یہ نئی بات نہیں ہے۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اردو کے حق میں بڑی بڑی باتیں کرنے والے اور اردو کے نام پر اپنی دکان چلانے والے اپنے مفادات کی خاطر اردو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک المیہ ابھی حال ہی میں راجیہ سبھا کے لیے منتخب ہونے والے معروف شاعر عمران پرتاپ گڑھی کا پیش آیا ہے۔ عمران کی تو دکان اردو سے ہی چلتی رہی ہے، جب تک وہ صرف ہندی کے کوی مانے جاتے رہے، اس وقت تک ان کو پہچاننے والے بس گنے چنے لوگ ہی ہوتے تھے۔ لیکن اردو کو اپنانے کے بعد ہی وہ مقبولیت کی بلندی تک پہنچ پائے اور اسی وجہ سے انھیں کانگریس پارٹی نے ہاتھوں ہاتھ لیا بھی لیکن اردو سے دغا کرتے ہوئے انھوں نے راجیہ سبھا میں اردو کے بجائے ہندی میں حلف لیا۔ اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ اردو دوستوں اور مشاعروں کے منتظمین کو چاہئے کہ ایسے دھوکے باز لوگوں کا کھل کر بائیکاٹ کریں، تبھی ان کے عقل ٹھکانے آئے گی۔ یہ معاملہ صرف ایک عمران پرتاپ گڑھی کا نہیں ہے۔ اس کے پیچھے دراصل ایک شکست خوردہ ذہنیت کام کرتی ہے۔ اس سے قبل اردو کے ایک مقبول ترین شاعر "وسیم بریلوی" جن کا اصل نام زاہد حسن خان ہے، وہ سماجوادی پارٹی کے ٹکٹ پر ۶ سال تک اتر پردیش قانون ساز کونسل کے رکن رہے اور اب سکدوش بھی ہو چکے ہیں، انھوں نے بھی کبھی ایوان میں یا ایوان کے باہر اردو کے مفاد میں کوئی بات نہیں کی، صرف مشاعرے پڑھنے میں دلچسپی رکھتے رہے۔ اردو حلقوں کے سرکردہ افراد کی یہ لاتعلقی افسوسناک امر ہے۔ ان کی یہ بے حسی اور سرکاری اداروں کی عدم توجہی کے سبب گنگا جمنی تہذیب جیسی عظیم روایت کی حامل زبان "اردو" کو لے کر احساس کمتری کا شکار ہونا اور اس کے مستقبل پر آزادی کے اتنے برسوں بعد بھی سوالیہ نشان کا موجود ہونا ایک المیہ سے کم نہیں۔ اردو داں طبقے نے اگر اب بھی سنجیدگی سے اس طرف توجہ مرکوز نہیں کی تو اس شاندار وراثت کا کیا حشر ہوگا، اس کے لیے آنے والے وقت کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا بلکہ اس کی تباہی اور ہولناکی کو ایک عام فہم آدمی بھی بیان کر سکتا ہے کہ جو قوم اپنی زبان سے کٹ جاتی ہے وہ اپنے مستقبل کو اپنے دشمنوں کے ہاتھوں گروی رکھنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ اس لیے ہمیں خود چوکنا رہنے اور دوسروں کو چوکنا رکھنے کی ذمے داری بھی اٹھانی تو پڑے گی ہی۔

"ادبی نشیمن" کا یہ شمارہ پریس میں جا رہا تھا کہ علی گڑھ سے پروفیسر اصغر عباس کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ ادارہ "ادبی نشیمن" ان کی مغفرت اور بلندی درجات کے لئے دعا گو ہے۔ بہر حال اب یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اہم مضامین اور نئے تجربات کا سلسلہ جاری ہے۔ اپنے خیالات، تاثرات اور تعمیری تنقید سے ہمیں نوازیں تاکہ ہم اور ہمارے قلمکار نئے حوصلے کے ساتھ اگلے شمارے میں پھر حاضر ہو سکیں۔

شکریہ

ڈاکٹر سلیم احمد

شبلی شناسی کے گل سرسبد: مولانا سید سلیمان ندوی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
(اعزازی رفیق، دارالمصنفین، اعظم گڑھ Mob. 9838573645)

علامہ سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] علامہ شبلی کے سب سے لائق شاگرد اور جانشین تھے۔ تصنیف و تالیف کے لئے علامہ نے ان کی تربیت کی تھی۔ خاندانی طبابت کے پیشے سے بچا کر علمی دنیا کا سرتاج بنایا اور ندوہ کے جلسہ میں جب ہندوستان اور مصر کے عمائدین موجود تھے، اپنا عمامہ سر سے اتار کر ان کے سر پر رکھ دیا۔ یہ اسی دن طے ہو گیا کہ آئندہ گلشن شبلی کے مالی وہی ہوں گے۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ شبلی کی جانکنی میں ان کے سرہانے جب آنسو بہا رہے تھے، استاذ نے اشارے سے تمام کام چھوڑ کر سیرت کی تکمیل کے لئے کہا اور پھر خود ''سیرت، سیرت'' کہتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ نور اللہ مرقدہ

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی محسن کتابوں پر جو مضمون لکھا ہے، اس میں جگہ جگہ مولانا شبلی کا ذکر کیا ہے۔ ایک موقع پر ابن خلکان کے مطالعہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی نے ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد کے سفر سے واپس آ کر مجھے اس کے انگریزی یا فرنچ مترجم کا جب ایک تبصرہ دیا اور تعریف فرمائی کہ دیکھو یورپین کس وقعت سے کسی کتاب کو دیکھتے ہیں تو میرے دل میں ایک ٹھیس لگی اور میں نے ابن خلکان پر ایک تبصرہ لکھ کر پیش کیا جو الندوہ میں چھپا۔'' (مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص: ۱۰)

سید صاحب نے اپنے کلامی ذوق کے بارے میں لکھا ہے کہ علم کلام کا شوق تمام تر مولانا شبلی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ ان کی تصنیفات پڑھیں۔ ان کی حوالہ دی ہوئی کتابیں دیکھیں۔ سید صاحب اپنے قرآنی علوم و معارف سے دلچسپی کے ذکر میں لکھا ہے کہ

> ''سب سے آخری جلوہ قرآن پاک کا نظر آیا۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس کا آغاز کیا۔ مولانا حمید الدین مرحوم کی دلچسپ و مفید صحبتوں میں یہ چسکا اور آگے بڑھتا گیا اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ سیرت نبویؐ کی ہر بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد ہے اور حدیث نبویؐ اس کے نقش و نگار ہیں۔'' (مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص: ۱۲)

استاذ کی خواہش کے مطابق سید صاحب نے تمام کام چھوڑ دیئے، حتیٰ کہ دکن کالج پونہ کی پروفیسری چھوڑ دی اور آستانہ شبلی پر آ کر بیٹھ گئے اور سیرت کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا اور پورا ہی کر کے دم لیا۔ سیرت کی پہلی جلد ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی، اب تک کتاب کے بے شمار ایڈیشن ملک و بیرون ملک سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں تین دیباچے اور ایک مقدمہ شامل ہے۔ مقدمہ علامہ شبلی کے قلم سے ہے اور اپنے موضوع پر بے نظیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دبئی سے اس کا عربی ترجمہ شائع ہو کر عربوں میں مقبول ہوا۔ دو دیباچے مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ہیں۔ پہلا دیباچہ طبع اول

پر لکھا گیا تھا۔ اس میں سیرۃ النبیؐ کی عظمت، علامہ شبلی کی وصیت کے مطابق تدوین و تکمیل اور اشاعت کی تفصیل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سیرت نبویؐ جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے آج ۷/ سال کے بعد اس کی پہلی جلد شائقین کے ہاتھ میں جاتی ہے، میں اپنا دل اس وقت مسرت آمیز اطمینان سے لبریز پاتا ہوں کہ استاذ مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ میں جو فرض میرے سپرد کیا تھا الحمد للہ کہ اس کے ایک حصہ سے آج سبکدوش ہونا ہوں۔'' (سیرۃ النبی ج ا ص ۷، اعظم گڑھ طبع جدید، ۲۰۰۳ء)

علامہ شبلی کو اس کی اشاعت کی کتنی حسرت تھی اس کا اندازہ ان کے ایک خط کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''اگر مرنہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا، جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہوسکتی۔'' اس حسرت پر شاگرد کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''اس مسرت اور اطمینان کے ساتھ یہ حسرت ناک منظر بھی نگاہوں کے سامنے ہے کہ مصنف اپنی چار سال کی جاں کاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھ سے قوم کی نذر نہ کرسکا اور حسن عقیدت کے جو پھول سیکڑوں چمن کدوں سے چن کر اس کے ہاتھ آئے تھے ان کو آستانۂ نبوتؐ وہ خود نہ چڑھا سکا۔'' (ص ۷)

اس کے بعد سید صاحب نے سیرۃ النبیؐ کی تدوین کے لئے علامہ شبلی کی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ حتمی ارادے کے بعد پچاس ہزار کی بڑی رقم کا اعلان اور نواب بھوپال بیگم سلطان جہاں [۱۸۵۴ء - ۱۹۳۰ء] کی اعانت و ذمہ داری کی تفصیل سپرد قلم کی ہے اور لکھا ہے کہ

''فرماں روا خواتین اسلام نے جو مذہبی کارنامے اب تک انجام دیئے ہیں آئندہ مورخ غالباً اس کارنامے کو ان میں سب سے بڑا قرار دے گا کہ اس کا تعلق اس ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے بڑی ہستی ہے۔'' (ص ۷)

علامہ شبلی کی وفات کے بعد بھی بیگم سلطان جہاں نے اپنی زرافشانی کا سلسلہ فیض جاری رکھا۔ سید صاحب نے اس کا بڑے والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔ پھر سیرت نبویؐ کے مسودہ شبلی کی تربیت و تدوین کے مسائل کا ذکر ہے اور انھوں نے اس میں جو اصلاحات و تصحیحات کی ہیں ان کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اور اس احتیاط کے ساتھ کہ اگر میں کہیں ایک حرف بدلتا تو خواب میں بھی ڈرجاتا تھا۔

چار برس بعد اس کا دوسرا ایڈیشن کتابی سائز میں شائع ہوا اور اس میں جو کتابت وغیرہ کے اغلاط رہ گئے تھے انھیں درست کیا گیا۔ اس پر سید صاحب نے ایک صفحہ کا دیباچہ لکھا ہے۔ اس کا آغاز ان لفظوں میں ہوا ہے:

''سیرۃ نبویؐ جلد اول طبع اول کو شائع ہوئے آج چار برس ہوگئے ، اس اثنا میں خداوند تبارک وتعالی نے اس کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ خاکساران دار المصنفین کے لئے فخر و نازش کا سرمایہ ہے، نہ صرف یہ کہ عام قدردانوں نے اس کو جان ودل سے خریدا اور امراء ووالیان ممالک نے اس کی خدمت کو سعادت دارین سمجھا بلکہ خواص اور علماء کے طبقہ نے بھی اس کی قدر شناسی کی۔'' (ص ۶)

یہی نہیں یہ دوسرا ایڈیشن اس لحاظ سے بھی بے حد اہم ہے کہ مختلف طبقات کے اہل علم نے اسے میزان نقد میں جانچا اور پرکھا۔ سید صاحب نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ

''ہندوستان میں اہل علم کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس نے اپنے فن کی میزان نقد میں سیرت کے مضامین وتحقیقات کو نہ تولا، حفاظ نے اس کی آیات قرآنی کو پڑھا، محدثین نے اس کی حدیثیں جانچیں، ادیبوں نے اس کے عربی اشعار اور ترجموں پر نقد کیا، علمائے انساب نے اسماء کی تنقیح کی، منجموں اور حساب دانوں نے اس کے زائچوں اور تاریخوں پر نظر ثانی کی، اہل تاریخ وسیر نے واقعات کی جانچ پرتال کی اور ہم ممنون ہیں کہ نہایت خلوص ومحبت سے انھوں نے اپنے نتائج افکار سے ہم کو مطلع کیا اور ہم نے ان سے فائدہ اٹھایا۔'' (ص ۶)

سید صاحب کے قلم سے تیسرا دیباچہ طبع چہارم پر لکھا گیا ہے۔ پہلے سیرت کی مقبولیت پر مصنف اور جامع کی طرف سے اللہ کا شکر ادا

کیا گیا ہے۔اس کے بعد سیرت میں اغلاط کی تصحیح اور مسودہ سے مبیضہ اور دوسری طباعتوں کے اغلاط کی درستگی وغیرہ کی تفصیل قلم بند کی گئی ہے۔ ہندسوں کی بعض غلطیاں راہ پا گئی تھیں، انھیں درست کیا گیا ہے۔اس طرح علامہ شبلی کے پیش نظر جو قلمی نسخے تھے اور اب سید صاحب کے پاس ان کے مطبوعہ نسخے آ گئے تو ان سے بھرپور استفادہ کر کے ان کے حوالہ دیئے گئے ہیں اور ضروری اضافات بھی کئے گئے ہیں۔اس ایڈیشن میں جامع سیرت نے جو کچھ کیا ہے اسے ۸ /شقوں میں بیان کیا گیا ہے ۔ ان مقدمات سے جو سب سے بڑی بات سامنے آئی ہے، وہ سید صاحب کی اپنے استاذ سے بے پناہ محبت اور خود ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عقیدت بے پایاں ظاہر ہوتی ہے۔

۱۹۲۰ء میں سیرۃ النبیؐ کی دوسری جلد شائع ہوئی۔اس پر سید صاحب کا دیباچہ ہے۔ اس دیباچہ میں پہلی جلد کی مقبولیت کا ذکر ہے۔ پھر جنگ عظیم سے پیدا ہونے والے نقصانات دکھائے ہیں کہ کاغذ وطباعت کی گرانی کی وجہ سے سیرت نبویؐ تاخیر سے شائع ہو رہی ہے۔پھر اس جلد کے مشمولات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''پہلی جلد نبوت کے پرآشوب عہد غزوات پر مشتمل تھی اور دوسری جلد نبوت کی سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے، نبوت کی بست وسہ سالہ زندگی میں پہلی جلد بیس سال کے کارناموں کا مجموعہ تھی اور یہ جلد بقیہ آخری تین سال کے واقعات کا ذخیرہ ہے اور اس کے بعد اخلاق وشمائل شریفہ اور ازواج مطہرات واولاد کرام کا تذکرہ ہے۔'' (جلد دوم،ص:۹)

اس کے بعد مسودۂ سیرت اور اس کے ناتمام حصوں کی تکمیل کا ذکر ہے۔سید صاحب جن ابواب میں اضافہ کرنا چاہتے تھے، علامہ شبلی کے قلم سے اس کے متعلق یادداشت ملی تو اس کے مطابق اضافے کئے۔ اسی طرح اخلاق کے باب میں بھی بہت سے عنوانات سادہ تھے اور سید صاحب نے انھیں لکھا۔ استاذ سے اپنی تحریر کو ملانے سے بچانے کے لئے اضافہ اور تکملہ اور حواشی کی تمام عبارتیں ہلالین کے اندر دی گئی ہیں۔(ایضاً،ص:۱۰)

سیرت کی جلد سوم سید صاحب کے قلم سے ہے، اس میں علامہ شبلی کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ جلد چہارم جو منصب نبوت پر ہے علامہ شبلی کا ایک جگہ ذکر ہے۔سید صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع میں کیا تھا اور مذکورہ بالا مباحث میں سے عرب جاہلیت کے مذہبی اخلاقی حالات کے پچیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی۔ یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں، مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ وترمیم کی ضرورت ہوئی ہے، اس لئے ان صفحات کو ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں۔''

(سیرۃ النبی ج ۴ ص ۱۴، اعظم گڑھ طبع جدید ۲۰۰۳ء)

علامہ شبلی کے شاگردوں کی تعداد کم نہیں، مگر ان میں کوئی سید سلیمان نہیں ہوا۔وہ اپنے استاذ کے ذکر کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے۔ سیرۃ النبیؐ جلد پنجم شائع ہوئی تو اس کے دیباچہ میں سیرت کی ترتیب وتدوین کے بارہ میں لکھا کہ

''اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل میں میں نے امکان بھر اس خاکہ کی پیروی کی ہے، جس کا خیال حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانی کو تھا۔ان زبانی بیانوں اور تلقینوں کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے۔''(ص ۳)

اس کے بعد ان کے دو مکاتیب کے اقتباسات دلائل میں نقل کئے ہیں۔ پھر سلسلہ سیرت کے حسن قبول کا ذکر کیا ہے اور امرائے اسلام کے عنوان سے ریاست بھوپال کے تعاون کا ذکر ہے اور اس بات کا بھی ذکر ہے کہ بیگم سلطان جہاں کے جانشین نواب حمید اللہ خاں نے اسی طرح قدردانی فرمائی ہے، جس طرح سرکار عالیہ نے کی تھی۔علامہ شبلی نے بیگم سلطان جہاں کی فراخدلی اور امداد سیرت کے لئے ایک قطعہ کیا تھا۔وہ قطعہ بھی سید صاحب نے نقل کیا ہے۔وہ قطعہ یہ ہے:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہرصورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے

رہی تالیف وتنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطان ہے

علامہ شبلی نے جب وفات پائی تو بیگم صاحب نے بڑے درد بھرے لہجہ میں کہا تھا

کہ ''فقیر بے نوا تو چل بسا، اب سلطان کی باری ہے۔'' (ص:۵)

آخر میں سید صاحب جن کی عمر اس وقت پچاس سال ہو چکی تھی اس بات کا ذکر کیا ہے، اور اسی سلسلہ کی تکمیل میں خاک ہو جانے کی تمنا کی ہے۔

سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ ۵۸۰ صفحات پر مشتمل یہ جلد سید صاحب کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اپنے موضوع پر یہ بے حد اہم کتاب ہے۔ ۱۹۱۴ء میں سید صاحب اپنے استاذ کی خواہش کے احترام میں اس عظیم الشان کام کی تکمیل میں مصروف ہوئے اور زندگی کا بڑا حصہ اسی سیرت نبویؐ اور استاذ کی خواہش کی تکمیل میں لگا دیا۔ اس حصہ کے دیباچہ کے اخیر میں وہ لکھتے ہیں:

''سلسلہ سیرت کے بانی حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانیؒ کو مدت سے خواب میں نہیں دیکھا تھا۔ اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے، میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے اس کے بعض اجزا پڑے ہیں اور وہ اس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔'' (رحمہ اللہ تعالی)

(سیرۃ النبیؐ ج ۶ ص ۴، اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۰۳ء)

سیرۃ النبیؐ کی ساتویں جلد مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات کے بعد ۱۹۸۰ء میں ہندو پاک سے شائع ہوئی۔

۱۹۳۰ء میں سید صاحب نے یورپ کا سفر کیا۔ وہاں سے بزرگوں، دوستوں اور احباب کے نام جو خطوط لکھے ان کا مجموعہ ''برید فرنگ'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کا دیباچہ انھوں نے ''خطوط کا پس منظر'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں بھی علامہ شبلی کا ایک مقام پر ذکر آیا ہے۔ ہندوستان کی سیاسیات میں علامہ شبلی کے ایک طویل مضمون نے انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس کے بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں:

''ہندو بنگالیوں کے پر زور ایجی ٹیشن سے مجبور ہو کر انگریزوں نے ۱۹۱۰ء میں بنگال کی تقسیم کو منسوخ کر دیا۔ مسلمانوں کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ یہی زمانہ تھا جب نواب وقار الملک نے انگریزوں کی حکومت کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا اور مولانا شبلی مرحوم نے ''پولیٹکل کروٹ'' کا سلسلہ شروع کیا، جس نے مسلمانوں کے سیاسی رخ کو سرکار پرستی کی طرف سے پھیر کر صحیح سیاست کی طرف کر دیا۔''

(برید فرنگ ص ۸، اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء)

جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ بڑا عظیم الشان تاریخی کارنامہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف فکر شبلی کے فروغ و اشاعت میں حصہ لیا بلکہ علامہ کی ایک ایک تحریر تلاش کر کے انتہائی سلیقہ سے مرتب و مدون کر کے شائع کی۔ مقالات کی آٹھ جلدیں، اردو و فارسی کلیات اور ایک جلد میں ان کی منتخب ادبی تحریریں ''انتخابات شبلی'' کے نام شائع کیں۔ ترتیب و تدوین میں یہ ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصل شبلی فہمی اور شبلی شناسی کی داغ بیل انہی نے ڈالی اور انہیں نے اس میں وسعت پیدا کی۔ سب سے آخر میں ''حیات شبلی'' لکھ کر بقول آل احمد سرور [۲۰۰۲-۱۹۱۱ء] مولانا حالی سے وہ تاج فضیلت چھین لیا جو ''حیات جاوید'' کی بدولت ان کے سر پر تھا۔ یہاں ان کی مدونہ کتب کے دیباچوں کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔

مطبع نامی کان پور سے ۱۹۱۶ء میں مکاتیب شبلی جلد اول کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس میں دیباچہ شامل نہیں۔ طبع دوم معارف پریس اعظم گڑھ سے نکلا، اس میں دیباچہ شامل ہے۔ ۱۰/ صفحے کے اس دیباچہ کی ہر سطر ذکر شبلی سے عبارت ہے۔ ابتدا میں مکاتیب کی اہمیت پر اظہار خیال کیا ہے۔ پھر مکاتیب کے جمع و ترتیب کے آغاز، اعلان، پھر ہر طرف سے خطوط کی بارش کا ذکر کیا ہے۔ جن اہل علم اور تلامذہ نے علامہ شبلی کی ایک ایک سطر حفاظت سے سینہ سے لگا رکھی تھی، ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی کو اپنے اردو خطوط پسند نہ تھے بلکہ اپنے فارسی خطوط کو اہمیت دیتے تھے۔ اردو خطوط کو بدمزہ کہتے تھے۔ ان تمام تفصیلات کے بعد ان خطوط کی ادبیت اور انشا پردازی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے مہدی افادی [۱۹۲۱-۱۸۷۰ء] کی ایک تحریر نقل کی ہے اور واقعی یہ تحریر بہت عمدہ ہے۔ اس سے علامہ شبلی کی انشا پردازی کی خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔ آخر میں خود انھوں نے مکاتیب شبلی کی چھ خصوصیتیں بیان کی ہیں اور حق یہ ہے کہ ان چھ خصوصیتوں کے ذکر میں ان کے خطوط کی تمام خوبیاں گنا دی ہیں۔ طوالت کے خوف سے یہاں محض دو خصوصیات ان کے الفاظ میں نقل کی جاتی ہیں۔ مکاتیب شبلی کی پہلی خصوصیت سید صاحب نے اختصار اور

جامعیت کو قرار دیا ہے۔ پھر دوسری خصوصیت کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''درحقیقت مختصر نویسی کوئی ایسی خوبی کی بات نہیں ہے۔ اصل خوبی یہ ہے کہ اختصار لفظ کے ساتھ میں پوری وسعت موجود ہو۔ یہی خصوصیت مولانا کی انشا پردازی اور بلاغت کی جان ہے۔ وہ ایک ہی دوفقروں میں جو کچھ کہہ جاتے ہیں ہم مضمون میں ان کو نہیں کھپا سکتے۔ وہ چند لفظوں میں جو جادو پھونک دیتے ہیں اس زمانہ کے سامری سیکڑوں منتروں میں وہ روح نہیں پیدا کر سکتے۔''

(مکاتیب شبلی اول ص
۱۱ طبع جدید ۲۰۱۰ء)

مکاتیب میں القاب وآداب سے بے نیازی، جو اب کی پابندی، طرز تحریر کی انفرادیت وغیرہ خصوصیتوں کو واضح کرنے کے بعد آخری یعنی چھٹی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ

''مولانا ہر شخص کے اس کے مذاق اور تعلقات کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ شاگردوں کے خطوط میں علمی واصلاحی مشورے نظر آئیں گے۔ مولوی حبیب الرحمن شروانی کے خطوط میں زیادہ تر فارسی شاعری نوادر کتب اور ندوہ کے متعلق باتیں ہیں۔ پروفیسر عبد القادر سے ادب وتاریخ فارسی کے مباحث پر گفتگو ہے۔ مولانا حمید الدین صاحب سے تفسیر اور سیرت پر مکالمات ہیں۔ مسٹر عبد الماجد سے مغربیات پر باتیں ہیں۔ مسٹر مہدی حسن صاحب مصنف دائرہ ادبیہ کے نام کے خطوط میں محاسن ادبی اور لطافت شعری پر گلفشانیاں ہیں۔'' (ایضاص ۱۲)

آخر میں مکاتیب شبلی کے انتخاب کی ترجیحات کا ذکر ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے خطوط ان کے انتخاب میں نہ آسکے۔ یہ دیباچہ دونوں جلدوں کے لئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری جلد میں دیباچہ شامل نہیں ہے۔

مکاتیب شبلی کی اشاعت کے بعد انہوں نے علامہ شبلی کے مقالات کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا، جو آٹھ حصوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ پہلا حصہ مذہبی، دوسرا ادبی، تیسرا حصہ تعلیمی، چوتھا تنقیدی، پانچواں تاریخی، چھٹا حصہ بھی تاریخی، ساتواں فلسفیانہ، آٹھواں متفرق تحریروں کا مجموعہ ہے۔ میں نے ان تمام حصوں کا مفصل تعارف وتجزیہ اپنی کتاب ''آثار شبلی'' میں پیش کیا ہے۔

پہلی جلد پر مختصر سا دیباچہ ہے۔ مقالات شبلی کا ذکر کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم نے مستقل تصنیفات کے علاوہ مختلف عنوانات پر سیکڑوں علمی وادبی وسیاسی مضامین لکھے تھے جو ہنوز اخبارات ورسائل کے صفحات میں منتشر تھے۔ علم دوست اصحاب کا تقاضا تھا کہ ان پراگندہ موتیوں کو ایک سلک میں منسلک کر دیا جائے کہ وہ ہر شخص کو یکجا میسر آسکیں اور اہل علم ان سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں، اگرچہ مولانا مرحوم کے چند مضامین رسائل شبلی اور مقالات شبلی کے نام سے ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے تھے لیکن یہ دونوں مجموعے ناتمام ہیں اور صرف چند تاریخی اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس بنا پر ارادہ کیا گیا کہ مختلف عنوانات کے تحت اس عنوان پر ان کے تمام مضامین ایک ایک جلد میں یکجا کر دیئے جائیں تاکہ ان کے مضامین جن جن موضوع پر ہوں وہ الگ الگ مرقع میں نظر آئیں۔''

(مقالات شبلی اول ص ا)

مقالات شبلی کی دوسری جلد سے ساتویں جلد تک بغیر دیباچہ کے شائع ہوئی ہیں۔ البتہ آٹھویں جلد میں جو متفرق اور متنوع مضامین اور تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں دیباچہ شامل ہے۔ آٹھویں جلد بہت اہم ہے۔ اس میں بڑا تنوع اور گونا گونی ہے۔ اس سے علامہ شبلی کی مختلف حیثیتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم کے مضامین کا یہ مجموعہ ان کے متفرق اخباری مضامین، مختلف سفید تجاویز اور منصوبوں پر مشتمل ہے، اس مجموعہ پر سرسری نظر ڈالنے سے مصنف کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک ساتھ نظر پڑ جاتی ہے، اشاعت اسلام، وقف اولاد، اوقاف اسلامی، تعطیل نماز جمعہ، مجلس علم کلام، اشاعت کتب قدیمہ، ترجمہ انگریزی قرآن مجید، تالیف سیرت نبویؐ وغیرہ۔ مختلف قومی اور مذہبی تجویزیں انھوں نے قوم کے سامنے

بیش کیں ان میں سے کچھ کو اپنی کوششوں سے پورا کردیا، کچھ ایسی تھیں جو مناسب فضا نہ ہونے سے بار آور نہیں ہوئیں۔''

(مقالات شبلی ج ۸ ص ۵)

بقیہ دیباچہ اسی اقتباس کی تشریح وتوضیح ہے اور اس قدر عمدہ ہے کہ یہاں انکے اقتباسات طوالت کے باوجود نقل کئے جاتے ہیں:

۱۔اشاعت اسلام

''اشاعت اسلام کا کام انھوں نے باقاعدہ شروع کردیا تھا اور مجھے میری قومی خدمت کی تعلیم کی غرض سے مددگار ناظم بنادیا تھا۔ یاد ہوگا کہ ۱۹۰۸ء میں ارتداد کا جو عظیم الشان طوفان اٹھا تھا، اس کے مقابلہ کے لئے جو لوگ اٹھے تھے ان میں ایک سربرآوردہ نام مولانا مرحوم کا بھی ہے۔ وہ شاہجہاں پور وغیرہ خود دورہ کو نکلے۔ راج پوتانہ کے اطراف میں معتمد آدمی بھیجے۔ ندوہ میں سنسکرت پڑھانے کا انتظام کیا۔ کئی طالب علموں کو اس درجہ میں داخل کرکے ان کو اس حد تک تیار کیا کہ اس درجہ کے ایک مسلمان طالب علم نے شاید ۱۹۱۰ء کے ندوہ کے اجلاس دہلی میں جب ٹھیٹ ہندی میں تقریر کی تو حاضرین کو اس کے پیدائشی پنڈت ہونے کا گمان ہوگیا اور وہ اس وقت دور ہوا جب لوگوں نے اس سے قرآن سنانے کی فرمائش کی۔ اتفاق دیکھئے کہ اس کے قرآن سنانے کا لحن بھی نہایت دلاویز تھا، اس وقت اس نے سورہ رحمن کی قرات اس خوبی سے کی کہ سارا مجمع آئینہ حیرت تھا۔'' (ص-۶۵)

۲۔تحریک وقف علی الاولاد:

''وقف علی الاولاد کا مسئلہ جس میں سرسید ناکام رہ چکے تھے مولانا کی کوششوں سے ایسا کامیاب ہوا کہ حکومت وقت کو اس کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اور مسٹر محمد علی جناح کی تحریک سے اسمبلی نے اس کو قانون بنانا منظور کیا۔'' (ایضا)

۳۔تعطیل جمعہ:

''نماز جمعہ کی تعطیل کے مسئلہ کو اٹھایا اور اس حد تک اس کو گورنمنٹ سے منوالیا کہ جو مسلمان نماز جمعہ میں جانا چاہیں وہ ایک مقررہ وقت کے لئے جاسکتے ہیں۔'' (ایضا)

۴۔سیرۃ نبویؐ

''ان کی سیرت نبویؐ کی تجویز ایسی سرسبز ہوئی کہ آج ہماری زبان اس مقدس لٹریچر کی فراوانی، بلندی اور افادیت پر بجا فخر کرسکتی ہے۔'' (ایضا)

۵۔اوقاف اسلامی:

''عام اوقاف اسلامی کا کام انھوں نے اخیر زندگی میں شروع کیا تھا اور ناتمام رہا مگر اکثر صوبوں میں ان کی ناتمام کوششوں کی آواز بازگشت گونجی اور سالہا سال کے بعد صوبوں کی حکومتوں نے اس کے متعلق اب کچھ نہ کچھ کیا ہے۔'' (ایضا)

۶۔سیاسیات:

مولانا شبلی کی سیاسیات پر نسبتاً کم لکھا گیا ہے۔ سید صاحب نے حیات شبلی اور زیر نظر مقالات شبلی (ج:۸) کے دیباچہ میں جو کچھ لکھا ہے دوسرے لکھنے والوں نے اسی کی تشریح وتعبیر کی ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا عملاً سیاسی نہ تھے مگر وہ اپنے خیالات میں نہایت سخت سیاسی تھے، اتحاد عالم اسلامی کے وہ پہلے سفیر تھے، علماء اور رہنمایان قوم میں سب سے پہلے ان ہی نے اسلامی ممالک کا سفر کیا اور سلطان ٹرکی سے اعزاز کا تمغہ پایا، جب وہ واپس آئے تو انگریزی حکومت نے ان کی کڑی نگرانی رکھی، کئی سال تک وہ جاسوسوں کے نرغہ میں رہے اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ عثمانی خلافت اور اتحاد اسلامی (پین اسلامزم) کے جس سے اس زمانہ میں بہت کچھ ڈرا جاتا تھا ہندوستان میں مبلغ ہیں''

(ص۶-۷)

اس کے بعد سید صاحب نے شبلی کے ٹرکی جانے سے پہلے ٹرکی کے لئے چندہ جمع کرنے، شہر آشوب اسلام لکھنے اور لکھنؤ کے جلسہ میں پڑھنے۔ اور مسلمانوں کے مسائل ومعاملات پر خوش کن خبر سے خوش ہونے اور غم انگیز خبروں سے دل گیر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ پھر ان کے سیاسی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ

''مولانا کالج میں گو سرسید کے ساتھ رہتے تھے مگر مذہبی اختلاف کے ساتھ ساتھ موصوف کو سرسید کے آخری سیاسی خیالات سے حد درجہ

اختلاف تھا اور اس کو وہ ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے حق میں سخت مضر سمجھتے تھے، بلکہ اعلانیہ وہ کانگریس کی حمایت کرتے تھے اور اس وقت کی کانگریس کے خیالات سے پوری طرح متفق تھے۔'' (ص:۷)

اس کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے سرسید سے سیاسی اختلاف، جمہوری نظام کے حق میں تقریر، سرسید کا جواب لکھنا، تقسیم بنگال، جنگ بلقان، واقعہ مسجد کان پور، مسلم لیگ کی مخالفت کی تفصیل لکھی ہے، صحافت کے سلسلہ میں مولانا شبلی کی کوششوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''۱۹۱۲ء میں جو بڑا انقلاب انگیز سال تھا مسلمانوں کی آزاد اخبار نویسی کا سال آغاز ہے، جب لاہور سے زمیندار نے رنگ پلٹا اور کلکتہ میں الہلال نمودار ہوا تو وسط ہند کیسے خالی رہ سکتا تھا چنانچہ لکھنؤ میں سید میر جان کی کوشش اور مولانا کے زیر مشورہ مسلم گزٹ نکلا، مولانا اس میں کبھی نام سے اور کبھی بے نام مضمون لکھتے تھے، مولوی وحید الدین سلیم مرحوم کو اس کی ایڈیٹری کے لئے مولانا ہی نے بلوایا تھا۔''

(ایضاص ۸۔۹)

بعد ازاں علامہ شبلی کی انگریزی ترجمہ قرآن کی کوششوں کا ذکر ہے۔ دارالمصنّفین کی تجویز، ندوہ کی تعمیرات، ندوہ کے طلبہ کی کامیابیوں، قدیم عربی کتب کی اشاعت کی تجویز، مجلس علم کلام اور المامون کی تنقید کا جواب وغیرہ موضوعات پر علامہ شبلی کی کوششوں اور کاوشوں کی تفصیل لکھی ہے۔ آخر میں اس جلد میں شامل مضامین کی جمع وتدوین پر روشنی ڈالی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دیباچہ میں علامہ شبلی اور ان کے افکار کی تفصیل سے وضاحت ہوتی ہے۔ یہ سید صاحب کا بہت اہم دیباچہ ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک بڑا کارنامہ علامہ شبلی کے اردو وفارسی کلام کی تدوین بھی ہے۔ جسے انھوں نے کلیات شبلی کے نام سے شائع کیا۔ کلیات فارسی بغیر دیباچے کے شائع ہوا ہے اس لئے اس سلسلہ میں ان کی کاوشوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ البتہ کلیات شبلی اردو پر انھوں نے ایک طویل مضمون جس میں علامہ شبلی کی شاعری اور خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس سے ان کی محنت اور تگ ودو کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا شبلی کی زندگی ہی میں علامہ کے کلام کے کئی مجموعے دہلی ولاہور سے شائع ہو گئے تھے جس کی تفصیل آثار شبلی میں دی گئی ہے۔ سید صاحب نے اس وقت تک جتنا کلام دستیاب تھا تلاش کر کے یکجا کر رکھا تھا، جسے مرتب کر کے شائع کیا۔

علامہ شبلی ایک بڑے شاعر تھے، مگر ان کے علمی کارناموں کے مقابلہ میں ان کی شاعری اس درجہ کی نہیں ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم کے علمی کمالات میں اگرچہ فارسی اور اردو کی شاعری بھی داخل ہے تاہم انھوں نے بذات خود کبھی اس کو اپنا قابل فخر کارنامہ قرار نہیں دیا اور اس حیثیت سے کبھی اپنے ہم عصروں کی صف میں حریفانہ حیثیت سے کھڑے نہیں ہوئے بلکہ یہ ان کا ایک تفریحی مشغلہ تھا۔''

(کلیات شبلی دیباچہ طبع اول ص ا)

سید صاحب کے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ بہرحال علامہ شبلی سے متعلق شاید سب سے زیادہ دیباچے اور تقدمے سید صاحب نے لکھے اور ان کے فکر وخیال کی وضاحت کی۔ واقعہ یہ ہے کہ فکر شبلی کی تفہیم کے لئے ان دیباچوں کا بھی مطالعہ ضروری ہے۔

سید صاحب نے دارالمصنّفین سے جب الکلام شائع کی تو اس پر تنبیہ کے عنوان سے دیباچہ لکھا اور علامہ شبلی کے عقائد کے بارے میں قدرے تفصیل سے لکھا۔ دراصل الکلام کی بعض عبارتوں کو سامنے رکھ کر علامہ شبلی کی کم از کم دوبار تکفیر کی گئی۔ یہی سبب ہے کہ سید صاحب نے اس کے دیباچہ میں بدلائل ثابت کیا ہے کہ علامہ شبلی کے دینی عقائد وہی تھے جو اہل سنت والجماعت کے ہیں۔ اپنے موقف کی تائید میں انہوں نے الکلام، علم الکلام اور علامہ کے ایک اعلان سے شواہد فراہم کئے ہیں۔ اور جن عبارتوں کو سامنے رکھ کر بعض علماء نے فتاوے صادر کئے تھے، ان کو ملاحدہ کی کتابوں کے اقتباسات قرار دیا ہے۔ علامہ شبلی نے بھی یہی وضاحت کی تھی۔ سید صاحب نے الکلام پڑھنے والوں کو تنبیہ کی ہے کہ ملاحدہ کے جو اقوال ہیں انھیں رد کرنے کے لئے کتاب میں درج کیا گیا ہے۔ سید صاحب نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ملاحدہ کے اقوال نقل کرنے میں اسلاف کے دو طریقے رہے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ رہا ہے کہ ملاحدہ کے اقوال نقل کئے بغیر ان کا

ردلکھا جائے اور دوسرا طریقہ یہ رہا ہے کہ ان کے اقوال نقل کر کے ردلکھا جائے۔مولانا شبلی کا یہی دوسرا طریقہ تھا جن لوگوں نے تکفیر کا فتوی دیا تھا، در اصل انھوں نے ملاحدہ کے اقوال کو علامہ شبلی کا قول سمجھ لیا تھا یہ پورا دیباچہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی سوانح شبلی کے دور آخر کے چشم دید شاہد تھے۔ اکثر ان کی تحریروں میں علامہ شبلی کے اقوال وخیالات آجاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کا ذکر کہیں اور ملنا مشکل ہے ۔ اسی طرح کی دو باتیں مولوی سید یوسف حسین کی کتاب ''عطر سخن'' کے مقدمہ میں آگئی ہیں۔

مولوی سید یوسف حسین صاحب موضع چھپرا ضلع سارن بہار کے رہنے والے تھے۔ان کا ادبی مذاق بہت پختہ تھا۔اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ انہوں نے انتخابات کے پانچ مجموعے نسیم سخن، غنچہ سخن، گل سخن، عطر سخن اور روح سخن مرتب کئے۔۱۹۳۰ء میں مرتب کے صاحبزادے سید احمد حسین نے اپنے والد کی ادبی یادگار شائع کی تو اس کا مقدمہ مولانا سید سلیمان ندوی سے لکھوایا۔ اس مقدمہ میں انہوں نے علامہ شبلی کی تین باتوں کا ذکر کیا ہے اور وہ باتیں اس قابل ہیں کہ ان کا ذکر نمایاں طور پر کیا جائے۔

مولانا حالی کا خیال ہے کہ سخن گوئی سے زیادہ سخن فہمی مشکل ہے۔علامہ شبلی کا بھی یہی خیال تھا۔مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

'' مولانا محمد فاروق چریا کوٹی رحمۃ اللہ علیہ مولانا شبلی علیہ الرحمہ کے استاد کل تھے۔اور مجھے بھی ان سے عربی ادب وشعر میں تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ع

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم

جب میں نے شروع شروع عربی میں شعر کہنا شروع کیا اور اصلاح کی غرض سے استاد کے سامنے پیش کیا تو فرمایا ''شعر کہنے سے شعر سمجھنا زیادہ مشکل ہے۔ اس لئے اپنے شعر کہنے سے زیادہ دوسروں کے شعر سمجھنے کی مشق پیدا کرو۔'' مولانا شبلی مرحوم بھی فرماتے تھے کہ ''سخن گوئی سے زیادہ سخن فہمی مشکل ہے۔'' اور اس بارہ میں مولانا حالی مرحوم کے بے حد مداح تھے۔ایک دفعہ کا واقعہ بیان کرتے تھے کہ جب پہلے پہل جاحظ بصری (المتوفی ۲۵۵ھ) کی کتاب البیان والتبیین چھپ کر مصر سے آئی تو میں نے اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا، کتاب کا کوئی خاص موضوع سمجھ میں نہیں آیا۔اس میں عرب کے مشہور فصحا اور بلغاء کے کلام کے ٹکڑے یکجا تھے۔اتفاق سے رات کو مولانا حالی (جو ان دنوں علی گڑھ کالج میں رہتے تھے) آئے اور وہ کتاب لے گئے ۔صبح کو یہ کہہ کر واپس کی کہ ''یہ نثر کا حماسہ ہے۔'' مولانا فرماتے تھے کہ ان کا یہ فقرہ سن کر میں پھڑک گیا اور عقدہ حل ہو گیا۔'' غرض یہ تھی کہ جس طرح عربی نظم میں حماسہ شعرا کے بہترین کلام کا مجموعہ ہے ،اسی طرح جاحظ نے گویا عربی زبان اور خطیبوں اور انشا پردازوں کے مختلف عمدہ ترین نثر کا یہ مجموعہ فراہم ہو گیا ہے اور یہی اس کا موضوع ہے۔''

(مقدمہ عطر سخن ص ۱۳)

حماسہ کو علامہ شبلی نے عربی ادب کا قرآن بتایا ہے۔سید صاحب لکھتے ہیں:

''حماسہ کا جامع ابوتمام ہے، جو خود ایک بڑا صاحب دیوان شاعر اور بحتری کا مدمقابل تھا،لیکن فن کے تمام نقادوں کا فیصلہ ہے کہ ابوتمام کی لازوال شہرت ایک دیوان کے مصنف اور شاعر ہونے کی رہین منت نہیں بلکہ حماسہ کے مولف اور جامع ہونے کی ممنون ہے۔گیارہ سو برس کے قریب ہوئے کہ اسی حماسہ کی بدولت ابوتمام کا نام ادبائے عرب میں سرفہرست نظر آتا ہے۔ اور بقول مولانا شبلی ''وہ عربی ادب کا قرآن ہے۔'' (عطر سخن ص ۱۴)

شعری انتخابات میں علامہ شبلی کو سب سے زیادہ مرزا مظہر جان جاناں کا خریطہ جواہر پسند تھا۔سید صاحب لکھتے ہیں:

''جب ہندوستان کی زبان فارسی تھی ،ہر لکھے پڑھے آدمی کے پاس ''سفینہ

یا بیاض'' کے نام سے کاغذوں کے چند سادہ اوراق ہوتے تھے جن پر ہر صاحب ذوق اپنی پسند سے دوران مطالعہ یا باہم صحبتوں میں جو اچھے اشعار پڑھتا یا سنتا تھا ان کو وقتاً فوقتاً قلم بند کر لیتا تھا اور اس طرح ہر قدر شناس کے پاس شعرا کے اچھے اور منتخب شعروں کا ایک الگ مجموعہ تیار ہو جاتا تھا۔ اس قسم کے سفینے یا بیاض ہر پرانے علمی خاندان میں اب بھی موجود ملیں گے اور اکثر مشرقی کتب خانوں میں اس طرح کے متعدد نادر اور منتخب مجموعے محفوظ ہیں۔ استاد مرحوم کی زبانی سنا تھا کہ ان کو مرزا صاحب کا ایک اس قسم کا انتخاب حیدرآباد دکن میں ملا تھا اور وہ اس کی تعریف کرتے تھے۔ لیکن اس قسم کے تمام فارسی انتخابات میں وہ مرزا مظہر جان جاناں کے انتخاب کو جو خریطہ جواہر کے نام سے مشہور ہے اور چھپ بھی گیا ہے سب سے زیادہ پسند فرماتے تھے۔'' (عطر سخن ص ۱۴)

علامہ شبلی کی اسی پسندیدگی کی بنا پر مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے خریطہ جواہر کو دارالمصنّفین سے شائع کیا۔ اس کی تفصیل راقم کی کتاب ''شاہ معین الدین احمد ندوی حیات وخدمات میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

علامہ شبلی نے ''تاریخ بدء الاسلام'' ایم اے او کالج کے نصاب کے لئے بقول شخصے رکھ کر سرسید کی فرمائش پر تیار کی تھی اور وہ تقریباً ان کی زندگی تک نصاب میں داخل رہی۔ اسے سیرۃ النبی کا تتمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ پھر شعرالعجم جامعہ پنجاب لاہور کے نصاب میں شامل ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد شعرالعجم، موازنہ انیس ودبیر اور مقالات جلد اول وغیرہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں براہ راست یا مددگار کتب کے طور پر شامل ہوئیں۔ دارالمصنّفین نے ''انتخابات شبلی'' انہی کے لئے شائع کیا تھا۔ اس حوالہ سے زیر نظر کتاب میں کوئی تحریر شامل نہیں تھی، اس لئے سید صاحب کا یہ اقتباس شامل کیا جارہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''خوشی کی بات ہے کہ ہماری یونی ورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا سلسلہ پھیل رہا ہے اور ان اگلے بزرگوں کی کتابیں اور تحریریں بھی پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں جنہوں نے اپنے قلم کے اعجاز سے جدید اردو ادب کو پیدا کیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرۃ الاستاذ مولانا شبلی مرحوم کی کتابیں بھی پڑھی جاتی ہیں جو اردو ادب میں خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ مسلم یونی ورسٹی میں ''سرسید اور ان کے رفقا'' کا جو ایک خاص دور رکھا گیا ہے، اس کے ضمن میں مولانا کی تصانیف کو پڑھ کر ان کے ادبی مضامین وخیالات کو یکجا کرنا پڑتا ہے، اس مشکل کو پیش نظر اے او کالج کے نصاب کے لئے بقول شخصے رکھ کر سرسید کی فرمائش پر تیار کی تھی اور وہ تقریباً ان کی زندگی تک نصاب میں داخل رہی۔ اسے سیرۃ النبی کا تتمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ پھر شعرالعجم جامعہ پنجاب لاہور کے نصاب میں شامل ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد شعرالعجم، موازنہ انیس ودبیر اور مقالات جلد اول وغیرہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں براہ راست یا مددگار کتب کے طور پر شامل ہوئیں۔ دارالمصنّفین نے ''انتخابات شبلی'' انہی کے لئے شائع کیا تھا۔ اس حوالہ سے زیر نظر کتاب میں کوئی تحریر شامل نہیں تھی، اس لئے سید صاحب کا یہ اقتباس شامل کیا جارہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''خوشی کی بات ہے کہ ہماری یونی ورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا سلسلہ پھیل رہا ہے اور ان اگلے بزرگوں کی کتابیں اور تحریریں بھی پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں جنہوں نے اپنے قلم کے اعجاز سے جدید اردو ادب کو پیدا کیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرۃ الاستاذ مولانا شبلی مرحوم کی کتابیں بھی پڑھی جاتی ہیں جو اردو ادب میں خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ مسلم یونی ورسٹی میں ''سرسید اور ان کے رفقا'' کا جو ایک خاص دور رکھا گیا ہے، اس کے ضمن میں مولانا کی تصانیف کو پڑھ کر ان کے ادبی مضامین وخیالات کو یکجا کرنا پڑتا ہے، اس مشکل کو پیش نظر مناسب سمجھا گیا کہ ''انتخابات شبلی'' کے نام سے مولانا کی شعرالعجم اور موازنہ سے جو خالص ادبی کتابیں ہیں ایک ایسا مرقع تیار کر دیا جائے جو ایسے طالب علموں کے کام آئے۔

اس انتخاب میں ایک خاص پہلو پیش نظر رہا ہے کہ کلام کے حسن وخوبی اور خاص طور سے شعر کی تنقید اور اس کے محاسن ومعائب کے اصول کو ان کی ان دو کتابوں سے لے کر اس طرح یکجا کر دیا جائے کہ کسی کلام کے عام محاسن اور خاص طور سے شاعری کی حقیقت اور اس کے جانچنے کے اصول ومعیار طلبہ کے ذہن نشین ہو جائے۔

ہماری زبان میں اس قسم کی تنقیدی کتاب اصولی حیثیت سے تھی بھی نہیں، اس لئے اس انتخاب نے یہ کمی بھی پوری کر دی۔

یہ انتخاب اصل میں مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کی فرمائش سے شروع کیا گیا اور اس نے اس کی قدر کر کے اس کو اپنے ایف اے کے نصاب میں شامل کر لیا ہے۔ امید ہے کہ ہمارے ملک کی دوسری یونی ورسٹیاں بھی اس کی پوری قدر کریں گی۔''
(انتخابات شبلی، ص:۱)

☆☆☆

اردو تحقیق وتنقید کی ترقی میں حسرتؔ کا کردار: ایک تحقیقی جائزہ

ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری

صدر شعبۂ اُردو، مرکز تحقیق، گورنمنٹ کملا راجا گرلس پی۔جی۔آٹونامس کالج، گوالیار (ایم۔پی۔) 98273-33039

اُردو ادب میں تحریک آزادی کے بے باک مجاہد آزادی، رئیس المتغزلین، رئیس الاحرار، سرگرم سیاسی کارکن، آئین ہند: جماعت کے رکن، صوفی، صحافی، شاعر وادیب، مولانا حسرتؔ موہانی نہایت سرگرداں، سیماب صفت اور متجسس شخصیت کے مالک تھے۔ دیکھنے والوں نے لکھا ہے کہ اُن کا حلیہ اور سراپا عجیب وغریب تھا۔ لیکن اس بے ڈول روپ میں ایک خوب صورت غزل گو، بے باک صحافی، عوامی رہنما، بے مثل مجاہد آزادی، بے پناہ روحانی قوت رکھنے والا صوفی منش شخص پوشیدہ تھا۔

اس عظیم ادیب وخطیب، محقق ونقاد اور مشرقی شعریات کے رمز شناس کی پوری زندگی نت نئے مصائب وآلام اور اُن سے نبرد آزمائی میں؛ جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ اس سعی مسلسل کے سبب خدا نے حسرتؔ کو ہمت، طاقت، شہرت، عزت، عظمت جیسی ثروت ودولت؛ ودیعت فرمائی تھی۔

اُن کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ نظم ونثر کا کوئی گلستان و چمنستان اُن کی ادبی کاوشات وخدمات سے خالی نہیں ہے۔ اسی طرح شخصیت وخدمات کا کوئی پہلو تشنہ اور نامکمل نہیں ہے۔ بلکہ ہر مورت کسی اوتار سے کم نہیں، ہر صورت قابل ذکر، ہر شکل مائل بہ ستائش اور ہر روپ لائق توصیف اور مستحق تقلید ہے۔

یہ بات قابل غور کہ ایک بڑا فن کار، ماہر وقادر شاعر اپنی تخلیقات سے شعر وادب پر مانندِ شجر چھایا نظر آتا ہے۔ شاعری کے تمام علائم سے اس کے مراسم مربوط ومضبوط ہوتے ہیں۔ اسے شعر سے عشق ہوتا ہے۔ یہ شعور جنوں رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ یوں شاعری کی مشق سے فن و سخن کے تمام رموز ونقوش، اُس پر آشکار رہتے ہیں۔ وہ نئی نئی اصطلاحات اور جدت طرازی سے اپنی شاعری کو دل کشی، دل نوازی، دل نشینی، دل بری اور دل ربائی کے درجے تک پہنچاتا ہے۔ مگر نثر کے گلستان ومیدان میں جب وہ قدم رکھتا ہے تو اُس کے قلم میں لغزش ولرزش اور کجی وخمیدگی نظر آنے لگتی ہے۔ دوسری جانب ایک اچھا نثر نگار اپنے مافی الضمیر کی عکاسی نثر میں کبھی سادگی، روانی سے اور کبھی مؤثر، مقناطیس اور جاذب نظر اسلوب سے کرتا ہے۔ لیکن نظم کے چمنستان ومیدان میں جب اس کی تشریف آوری ہوتی ہے تو وہ ادبی معرکے سر نہیں کر پاتا؛ جس کی اس سے امید کی جاتی ہے۔

حسرتؔ کا قلم اس لوچ، پوچ، لچر اور لچک سے یک سر پاک ہے۔ انہوں نے نظم ونثر دونوں شعبوں میں یک ساں طبع آزمائی کی۔ جب طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی تو گراں قدر غزلیات نے صفحۂ قرطاس پر رنگ بکھیرے اور جب نثر نگاری پر آمادہ ہوئے تو سیاسی، سماجی، ادبی، تحقیقی وتنقیدی مضامین سے ادب میں اضافے کئے۔ خصوصاً اردو تحقیق وتنقید کی ترقی میں اُنہوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس پر مزید سنجیدگی کے ساتھ غور وخوض کرنے

کی ضرورت ہے۔

حسرتؔ کی تحقیق، تنقید اور ترتیب وتدوین بلکہ نثر نگاری کا محور صحافت ہے۔ صحافت کے سلسلے سے تین (۳) رسائل و اخبار کے نام معروف ہیں۔

(۱) ماہ نامہ اردوئے معلیٰ
(۲) سہ ماہی تذکرۃ الشعراء
(۳) اخبار مستقبل

یہ وہ منبع اور سرچشمے ہیں ؛ جن کے سہارے ، ہمارے حسرتؔ کی نثر نگاری کے سارے دھارے پھوٹتے اور نکلتے ہیں ۔ اُن کی ساری تحقیقی ، تنقیدی ، تخلیقی نگارشات اور نثری کاوشات اسی سے وابستہ ہیں۔ ان میں افضلیت، اولیت، مقبولیت، شہرت اور اہمیت ''اردوے معلیٰ'' کو حاصل ہے۔ حقیقتاً حسرتؔ کی تقریباً بیش تر تحریریں اولاً اسی جریدے کی زینت بنیں ۔ بعد میں اسے مختلف عنوانات کے تحت یک جا کیا گیا اور ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔

' اردوئے معلیٰ ' کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا ۔ مارچ ۱۹۴۲ء تک جاری رہا ۔ اس چالیس (۴۰) سالہ مدت کے درمیان میں اُن کی گرفتاریوں اور قید و بند کے ساتھ رِسالہ نکلتا اور بند ہوتا رہا۔ لیکن عرصۂ تعطل ہو یا زمانۂ اشاعت اردوئے معلیٰ اپنے وجود کا ثبوت دیتا اور اہمیت کا احساس دِلاتا رہا۔ ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود تاہنوز اس کے بہت سے شمارے تحقیقی وتنقیدی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

حسرتؔ نے اردوئے معلیٰ جس زمانے میں جاری کیا۔ اس وقت عبدالحلیم شررؔ کا ''دِل گداز'' (جنوری ۱۸۸۷ء لکھنؤ) سرعبدالقادر کا ''مخزن'' (۱۹۰۱ء لاہور) منشی دیانرائن نگم کا'' زمانہ'' (۱۹۰۳ء کان پور) جیسے اہم ادبی رِسائل وجرائد منظر عام پر آ چکے تھے۔ مذکورہ رِسائل کے درمیان میں اپنی پہچان بنانا؛ کوئی آسان کام نہ تھا۔

اس سلسلے میں حسرتؔ نے اردوئے معلیٰ کے لئے ایک نئی راہ منتخب کی۔ سیاست اور ادب کے امتزاج سے رِسالے اور اپنی شناخت قائم کی۔ حالاں کہ اُس زمانے میں بھی رِسالہ' زمانہ' کان پور میں سیاسی قسم کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان مضامین کی نوعیت محض خبر اور معلومات پہنچانے تک محدود تھی۔ جب کہ اس کے برعکس اردوئے معلیٰ اپنے مدیر حسرتؔ موہانی کے ادبی اور سیاسی مسلک کا ترجمان تھا۔ اردوے معلیٰ کے حوالے سے ''حسرتؔ موہانی کے سیاسی رجحانات'' کے متعلق ہارون خاں شروانی نے لکھا ہے کہ :

'' اس رسالے کا ادبی معیار نہایت بلند۔۔۔ سیاسی اعتبار سے اس میں حسرت کی ' گرم' یعنی انتہا پسند پالیسی کی جھلک نظر آتی تھی اور اس میں ان کے یا دوسرے اہل قلم کے جو مضامین چھپتے تھے وہ بھی ادبی اعتبار سے اونچے درجے کے اور سیاسی اعتبار سے نمایاں پہلو لیے ہوتے تھے'' [۱]

اردوے معلیٰ کے ذریعے حسرتؔ نے ماضی کی صالح روایات، علمی وقلمی نوادرات کی ترویج ، نشر واشاعت اور درازی و ترقی میں بڑی کوششیں کیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اردوے معلیٰ کو ادبی نوادرات اور میراث کے تحفظ کا وسیلہ بنایا۔ اس کے توسط سے انہوں نے نئی نسل کے رجحانات ومیلانات کا معائنہ و مشاہدہ کیا۔ مذکورہ رِسالے کے حوالے سے حسرتؔ نے نوجوانوں کے ادبی ذوق وشوق کی تادیب وتربیت پر سنجیدگی سے غور و خوض کیا۔ یہی نہیں حسرتؔ نے اردوے معلیٰ کے مختلف شماروں میں سیکڑوں اہم اور غیر اہم شعراء کے تذکرے، کلام کے انتخابات اور کئی نوادرات محفوظ کر دیے۔

یہ بات اظہر من الشّمس کہ حسرتؔ کا شعری و صنفی محبوب 'غزل' ہے۔ اس زمانے میں جب کہ غزل کو موردِ تقصیر اور موردِ عتاب سمجھنے کا چلن عام ہو رہا تھا؛ انہوں نے اس کی مذمت کی اور بذاتِ خود مدبر بنے۔ ایک صاحبِ عمل کی حیثیت سے انہوں نے کلاسیکی غزل کو زندہ رکھنے کے جتن کئے۔ اس سلسلے میں محمد حسن رقم طراز ہیں :

'' بدنامی کے دور میں غزل کو آبرو دی۔ تصنع اور تقلید کے دور میں غزل کی کھوئی ہوئی آواز کا سراغ لگایا۔۔۔ غزل کی رنگینی کو نذیر احمد اور رسواؔ کے شریف زادے والے معاشرے کا گھر آنگن دے دیا ۔۔۔ اسی لئے ان (حسرتؔ) کی

شخصیت (اور شاعری) کا ایک پہلو مشرقی طرز کی روحانیت متصوفانہ عرفان کے لئے وقف ہے اور دوسرا سیاست کے لئے''۲؎

اس طرح کلاسیکی غزل کے خواہان و پسندگان پر حسرتؔ کا بڑا احسان ہے۔ چنان چہ غزل کی وکالت کے ساتھ اُنہوں نے مشرقی تنقید کو پھلنے، پھیلنے، پنپنے، پھولنے، پھیلانے اور فروغ دینے میں جو قابل قدر عملی اقدامات کئے ؛ اسے کسی طور فراموش نہیں کیا جاسکتا۔۔۔!

حسرتؔ نے اُردوئے معلیٰ کے ذریعے بے جا اور سستی شہرت پانے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ رِسالے کے چند اُصول بنائے اور قائم شدہ اصولوں پر ہر حال میں قائم المزاج رہے۔ یوں قائمی و دائمی پابندیوں نے رسالے کے وقار و معیار کو اعتبار بخشا۔ عام طور پر رسائل و جرائد کے مدیران مضامین و مقالات کی طوالت سے ہیبت و خوف محسوس کرتے ہیں۔ موجودہ فرسودہ دور میں اکثر معاصر مدیران صفحات کی حد بندیوں کے ساتھ مضامین و تخلیقات کی فرمائشیں کرتے ہیں۔ حسرتؔ کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ انہوں نے قلم کاروں کو یہ اختیار عطا کر رکھا تھا کہ وہ صفحات کی تعداد کی حد بندی سے آزاد ہیں۔ ان کے نزدیک بات جو کہنی ہو پوری کریں، کوئی بات ادھوری نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حسرتؔ نے معیاری مضامین کو اس کی ضخامت کی پرواہ کئے بغیر کئی قسطوں میں شائع کیا۔ یہ قسطیں جب یک جا ہوئیں تو مایہ ناز کتابیں بن گئیں۔ اردوئے معلیٰ کے قلمی معاونین میں امیر احمد علوی (ماہر رثائی ادب) شبلی نعمانی، نظم طباطبائی، علی حیدر، نواب رائے (پریم چند) احسن مارہروی اور محبوب الرحمٰن کلیم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ حضرات کے علمی و ادبی، تحقیقی و تنقیدی مضامین اور کہانیوں اور افسانوں نے ادب میں گوناگوں اضافے کئے۔ مثال کے طور پر علامہ شبلی نعمانی کی مشہور زمانہ کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' اسی رسالے میں پارچہ بافی کے مراحل سے گزری۔ اردو تنقید میں تقابلی تنقید کی اساس مذکورہ تصنیف ہی نے رکھی۔ احسن اللہ ثاقب کی ''مکاتیب امیر مینائی'' اور امداد امام اثر کی مشہور کتاب ''کاشف الحقائق'' کے بہت سے حصے اردوئے معلیٰ ہی میں شائع ہوئے۔ نظم طباطبائی کا پُرمغز طویل مقالہ ''ادب الکاتب والشاعر'' اسی رِسالے کی زینت بنا۔ کئی شماروں میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اس کی لسانیات میں بڑی اہمیت ہے۔

ان سب کے علاوہ خود حسرتؔ نے مشرقی تنقید کو فروغ دینے کے لئے کئی مضامین تحریر کئے۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور تبصروں نے اردوئے معلیٰ کے وقار و معیار میں مزید اضافے کئے۔ ایک مدیر کی حیثیت سے حسرتؔ کی تحقیقی و تنقیدی خدمات قابل اعتراف ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ نے ان کی تحقیقی و تنقیدی خدمات کا یوں اعتراف کیا ہے :

تحقیق و تنقید میں ۔۔۔ آزادی و بیباکی ۔۔۔ کی مثال میں ان کے اقبال کے ابتدائی کلام پر سخت اعتراضات اور حالیؔ کی قومی شاعری کے کم زور پہلوؤں کا جائزہ قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح اندر سبھا ۔۔۔ میں نئے مذاق پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور ۔۔۔ ڈرامائی خوبیوں پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے ۔۔۔ یہ رِسالہ تحقیق و تنقید، سیاسی مضامین، انتخاب کلام اور تبصروں کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے اگر اس کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو حسرت کو صرف ایک بڑا شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھا محقق اور ایک سنجیدہ اور قابل قدر نقاد ماننے میں کسی کو تامل نہ ہوگا''۳؎

حسرتؔ نے جیل کے احوال پر مبنی خود نوشت سوانح عمری ''مشاہدات زنداں'' کے عنوان سے جنوری ۱۹۱۰ء سے جنوری ۱۹۱۱ء تک قسط وار اردوئے معلیٰ میں شائع کیا۔ اسے بعد میں کتابی شکل دے دی گئی۔ بظاہر یہ کتاب خود نوشت ہے۔ مشاہدات پر مبنی ہے۔ لیکن اس میں تنقیدی نقوش پائے جاتے ہیں ایک قیدی کی نگاہ سے جیل کے مشاہدات قاری کے دل پر گہرے نقوش چھوڑتے ہیں۔ ان کی بڑی خوبی اور خوش اسلوبی ہے کہ انہوں نے آہ کو بھی واہ میں بدل دیا ہے۔ حسرتؔ کی حیات و شخصیت پر ریسرچ اسکالرس کے لئے یہ کتاب مشعل راہ

ثابت ہوسکتی ہے۔ مشاہدات زنداں پر عتیق صدیقی کا تبصرہ حسرتؔ کی خودنوشت میں مذکورہ خوبیوں اور تنقیدی نقوش کو واضح کرتا ہے :

''حسرتؔ نے اپنی قید و بند کی زندگی کا ایک سال جس حال میں بسر کیا تھا اور اس دوران میں ان سے جو وحشیانہ سلوک کیا گیا تھا، اس کو حسرت نے اگرچہ کچھ حد تک تفصیل کے ساتھ 'مشاہدات زنداں' میں قلم بند کیا ہے، لیکن ان کے اندازِ بیان کا یہ پہلو خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ اس میں کسی جگہ بھی بغض و عناد کا شائبہ نظر نہیں آتا''۴؎

تحقیقی، تنقیدی اور ادبی نقطۂ نظر سے حسرتؔ کا اہم کارنامہ اساتذہ کے دواوین کے انتخابات کی اشاعت ہے۔ ایک مدت تک حسرتؔ نے اردوئے معلیٰ کے ضمیمے میں قدیم و جدید شعراء کے کلام کا انتخاب مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ یہ بعد میں سلسلۂ تلامذہ کے لحاظ سے گیارہ (۱۱) جلدوں میں ''انتخاب سخن'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ مذکورہ جلدوں کے عنوانات اس طرح ہیں :

(۱) انتخاب سخن: سلسلۂ شاہ حاتمؔ
(۲) انتخاب سخن: سلسلۂ ذوقؔ
(۳) انتخاب سخن: سلسلۂ مومنؔ
(۴) انتخاب سخن : سلسلۂ مظہر جان جاناں
(۵) انتخاب سخن: سلسلۂ جرأتؔ
(۶) انتخاب سخن: سلسلۂ مصحفیؔ
(۷) انتخاب سخن: سلسلۂ آتشؔ
(۸) انتخاب سخن: سلسلۂ ناسخؔ
(۹) انتخاب سخن: سلسلۂ امیرؔ و اسیرؔ
(۱۰) انتخاب سخن: سلسلۂ غالبؔ
(۱۱) انتخاب سخن : سلسلۂ اساتذۂ متفرق

ان انتخابات میں اساتذہ کے ساتھ ساتھ ان کے معروف اور غیر معروف شاگردوں کو بھی جگہ دی گئی۔ ان کے حالات زندگی کو محفوظ کرنے کا سلسلہ بھی طویل مدت تک جاری رہا۔ حسرتؔ نے جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۳۰ء کے مشترکہ شمارے میں اس سلسلے کی تکمیل پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''حصہ اوّل سلاسل شعرائے اُردو جسمیں جملہ سلاسل شعرا کا نقشہ درج ہے شائع ہو چکا ہے قریب قریب کُل صاحب سلسلہ شعرا کا حال ۱۹۰۳ء سے ۱۹۳۰ء تک اردوے معلیٰ میں درج ہو چکا ہے''۵؎

یعنی یہ سلسلہ تقریباً اٹھائیس (۲۸) سال تک چلتا رہا۔ محمود الٰہی نے انتخاب سخن کے متعلق لکھا ہے کہ:

''انتخاب سخن، کے نام سے گیارہ جلدوں میں کوئی دوسو/۲۰۰ اساتذہ کے انتخاب کلام کی اشاعت حسرتؔ کا لازوال کارنامہ ہے۔ عمومی طور پر یہ جلدیں تین ہزار سے زائد صفحات کو محیط ہیں''

واقعی اُردو تحقیق و تنقید کے ارتقائی سفر میں حسرتؔ کی مذکورہ خدمات سے چشم پوشی ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی طرح ادبی تاریخ کو زیادہ معتبر بنانے میں حسرتؔ کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ کسی خواب کی تعبیر میں اٹھائیس (۲۸) سال کی زحمت اٹھانا، ان کے عزم و حوصلہ، بلند ہمتی، ثابت قدمی، صبر و تحمل کا بین ثبوت ہے۔ نیز اُردو ادب سے اور خصوصاً تحقیق و تنقید سے والہانہ عشق کا غماز ہے۔ گویا صحافت: حسرتؔ کے لئے عبادت و ریاضت بن گئی تھی چنان چہ مذکورہ ریاضت کا اعتراف بہتوں نے کیا ہے۔ اس ضمن میں ایم۔ حبیب خان نے لکھا ہے کہ:

''شعراء کے قدیم دواوین کی تلاش۔۔۔ ان کے کلام پر عالمانہ تنقید و تبصرہ۔۔۔ اس طرح حسرت کا اردو ادب پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے بیسیوں اساتذہ کے کلام کو تلف ہونے سے بچالیا اور ان کے حالات و کلام سے اردو داں طبقے کو روشناس کرایا۔ نیز ان کے کلام پر تنقید کر کے تبصرہ نگاری کی طرح ڈالی۔ اصل میں اردوئے معلیٰ کا سب سے بڑا کارنامہ اساتذہ کے حالات اور ان کے کلام کا انتخاب ہے''۶؎

حسرتؔ نے گل دستوں کا تعارفی سلسلہ بھی جاری کیا۔ یہ اردوئے معلیٰ میں ستمبر ۱۹۱۱ء سے جنوری ۱۹۱۳ء تک جاری رہا۔ اس مدت میں پانچ (۵) گل دستوں پر تعارفی نوٹ شائع ہوئے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے:

(۱) گلدستۂ شعرا،ضمیمہ انوارالاخبار ان لکھنؤ کا تعارف دسمبر ۱۹۱۱ء کے اردوے معلّٰی میں پیش کیا گیا۔

(۲) گُل کدۂ ریاض ، خیرآباد کے بارے میں اکتوبر ۱۹۱۱ء اور نومبر ۱۹۱۱ء کے شماروں میں قسط وار معلومات فراہم کی گئی

(۳) نتیجۂ سخن ،کلکتہ کا ذکر تین قسطوں میں جنوری ۱۹۱۲ء فروری، مارچ کے مشترکہ شمارے اور اپریل ۱۹۱۲ء کے شمارے میں مکمل ہوا۔

(۴) پیام یار،لکھنؤ کے بارے میں مئی ۱۹۱۲ء، جون اور جولائی ،اگست ۱۹۱۲ء کے شماروں میں بالاقساط اطلاعات فراہم کی گئیں۔

(۵) گورکھپور سے شائع ہونے والے ''فتنہ وعطر فتنہ'' کا تذکرہ اردوے معلّٰی جنوری ۱۹۱۳ء میں کیا گیا۔

اس کے بعد گل دستوں کے تعارف کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔

دراصل شعرائے اردو کے سلاسل اور ان کی حالات زندگی کی تحقیق کے دوران حسرتؔ کو اٹھارہ (۱۸) گل دستے دست یاب ہوئے تھے۔اس کی فہرست سن وسال ،شہروغیرہ کی تفصیل کے ساتھ ستمبر ۱۹۱۱ء کے شمارے میں ملتی ہے۔مثلاً:

(۱) گلدستۂ شعرا،ضمیمہ انوارالاخبار لکھنؤ (سنہ اجرا ۱۸۷۴ء)

(۲) گُل کدۂ ریاض ، خیرآباد (۱۸۷۹ء)

(۳) نتیجۂ سخن،کلکتہ (۱۸۸۲ء)

(۴) پیام یار،لکھنؤ (۱۸۸۳ء)

(۵) تحفۂ عشاق،لکھنؤ (۱۸۸۴ء)

(۶) کرشمۂ دل بر ،خیر آباد(۱۸۸۵ء)

(۷) ریاض سخن ،مرادآباد(۱۸۸۵ء

(۸) دامن گل چیں،لکھنؤ (۱۸۸۵ء)

(۹) فتنہ وعطر فتنہ،گورکھپور(۱۸۸۵ء)

(۱۰) نغمۂ بہار،لکھنؤ (۱۸۸۶ء)

(۱۱) گلدستۂ کیف ،اناؤ(۱۸۸۹ء)

(۱۲) دامن بہار،آگرہ(۱۸۹۲ء)

(۱۳) گل چیں،لکھنؤ (۱۸۹۲ء)

(۱۴) انتخاب،لکھنؤ(۱۸۹۳ء)

(۱۵) تصویر عالم ،لکھنؤ (۱۸۹۴ء)

(۱۶) ریاض سخن،مارہرہ(۱۸۹۴ء)

(۱۷) خدنگ نظر ،لکھنؤ (۱۸۹۷ء)

(۱۸) معیار،لکھنؤ (۱۸۹۸ء)

افسوس کہ مذکورہ اٹھارہ(۱۸) گل دستوں میں صرف پانچ (۵) کے تعارف شائع ہو سکے ۔حسرتؔ نے اس کے شائع کرنے کی غرض و غایت یوں بیان کی ہے:

''اپنے زمانۂ حیات میں یہ گُل دستے اچھے سمجھے جاتے ہوں یا برے،کامیاب ہوں یا ناکام ،مگر اس میں شبہ نہیں کہ مُرورِ ایّام نے میں ہر ایک کو بجائے خود تاریخی و ادبی دلچسپیوں کا ایک ایسا مجموعہ بنا دیا ہے،جس کا مطالعہ کسی حالت میں تضیعِ اوقات کا موجب نہیں ٹھہر سکتا!پس ہمارے خیال میں گزشتہ صدی عیسوی کے بعض مشہور گُل دستوں کی مختصر کیفیت کا تفریحِ ناظرین کے لئے اردوئے معلّٰی کے ہر پرچے میں سلسلہ وار شائع ہونا خالی از لطف نہ ہوگا''۷؎

حسرتؔ کی تحقیقی خدمات کے ساتھ ان کی تنقیدی نگارشات اور تبصروں کے بغیر گفتگو ادھوری معلوم ہوگی ۔حسرتؔ نے معرکۂ چکبستؔ و شررؔ کی ادبی بحث میں بھی حصہ لیا ۔گاہے گاہے تنقیدی مباحث میں شامل ہوکر تنقیدی مضامین بھی تحریر کئے ہیں۔ وہ صحت زبان کے اس قدر قائل تھے کہ حالیؔ کی گرفت کرنے سے بھی خودکو روک نہ سکے۔

''بعض اخباروں کی رائے ہے کہ مولانا حالی کی زبان کی لغزشوں پر اُن کی قومی خدمات کے لحاظ سے اعتراض نہ کرنا چاہئے لیکن مشکل یہ واقع ہوئی ہے کہ ہندوستان کا ایک حصہ بدقسمتی سے اُن کی کمالِ شاعری کا قائل ہے اوراُن کی پیروی کو باعثِ فخر سمجھتا ہے اور جو کچھ خواجہ صاحب کے قلم سے نکلتا ہے،اس کو

صحیح قرار دیتا ہے۔ایسی حالت میں اگر اُن سے زبان کی کوئی غلطی سرزد ہوتو اس سے چشم پوشی کرنا گویا دیدہ و دانستہ ایک حصۂ ملک کی زبان کو خراب کرنا ہے''۸؎

اسی طرح اگست ۱۹۰۳ء کے شمارے میں ''تنقیدِ ہمدرد'' کے فرضی قلمی نام سے ایک مضمون شائع ہوا۔اس کا عنوان تھا ''اردو زبان پنجاب میں'' اس مضمون میں علامہ اقبالؔ کے کلام پر اعتراضات کئے گئے تھے۔اس مضمون کے ساتھ حسرتؔ نے اپنا ادارتی نوٹ لکھا تھا۔

''ہم کو سخن سنجانِ پنجاب کی دل شکنی کے خیال سے اس مضمون کے شائع کرنے میں کسی قدر تامل تھا لیکن یہ دیکھ کر صاحبِ مضمون نے زبان کی کمزوریوں سے گزر کر حضرتِ اقبال کی نفسِ شاعری پر مطلق اعتراض نہیں کیا ہے ، بلکہ اس کی جابجا تعریف کی ہے۔ہم اس کی اشاعت کو جائز رکھتے ہیں۔امید ہے کہ اہلِ پنجاب کی انصاف پسند طبیعتوں کو یہ بیان ناگوار نہ گزرے گا''۹؎

اس قسم کی تحریروں،تنقیدی نوٹ اور مضامین کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔لیکن حسرتؔ کا اہم کارنامہ ''نکات سخن'' ہے۔یہ کتاب مئی ۱۹۱۶ء سے دسمبر ۱۹۱۸ء کے درمیان جیل میں تحریر کی گئی اور پھر اپریل ۱۹۲۲ء سے اگست ۱۹۲۴ء کے مابین جیل ہی میں حسرتؔ نے اس پر نظر ثانی کی۔ اردوے معلیٰ میں اس کے چار(۴) ابواب'' متروکات سخن، معائب سخن،محاسنِ سخن اور نوادرِ سخن'' منظر عام پر آئے۔اس کی شہرت کے سبب بعد میں سارے مضامین یک جا کر کے کتابی صورت میں شائع کئے گئے۔

'نکات سخن' کے علاوہ حسرتؔ کی بعض دیگر تنقیدی نگارشات بھی قابل ذکر ہیں۔بقول آل احمد سرورؔ:

''شاہ حاتم،مظہر جانِ جاناں،قائم،سودا ،رنگین، مصحفی، مجروح ،امیر اللہ تسلیم، اصغر علی خاں تسلیم،مومن،غالب،شاہ ظفر،شاہ نصیر،نوابدایونی،مظہر دہلوی، گستاخ،وفا رام پوری پر حسرت کے مضامین بڑے قابلِ قدر ہیں۔قائم اور مصحفی کو تو لوگوں نے فراموش کر دیا تھا،حسرت نے انہیں دوبارہ دریافت کیا اور اُن کی موجودہ مقبولیت میں حسرت کا بڑا ہاتھ ہے''۱۰؎

غرض کہ حسرتؔ موہانی کی تنقیدی و تحقیقی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اردو تحقیق وتنقید کی ترقی میں حسرتؔ کا کردار نا قابل فراموش ہے۔

حواشی:

(۱)حسرتؔ موہانی کے سیاسی رجحانات:ہارون خاں شروانی،بشمول ماہنامہ آجکل،نئی دہلی،اگست ستمبر ۱۹۸۱ء صفحہ ۱۸تا۱۹

(۲)حسرتؔ:کلاسکیت کی تشکیل نو کا شاعر: محمد حسن،بشمول کتاب حسرتؔ موہانی،بہار اردو اکادمی،پٹنہ، ۱۹۸۳ء صفحہ ۸۵،۹۰

(۳)اردوئے معلیٰ:پروفیسر آل احمد سرور،بشمول حسرتؔ موہانی:پروفیسر ثریا حسین،شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،۱۹۸۵ء صفحہ ۴۶

(۴) حسرت موہانی:قیدِ فرنگ میں:عتیق صدیقی ، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ، ۱۹۸۲ء،صفحہ ۶۴

(۵) اردوے معلیٰ :کانپور،جلد ۲۱،نمبر ۷،۸،۹،ماہ جولائی اگست وستمبر ۱۹۳۰ء ص ۱

(۶) حسرت موہانی:ایم ؛حبیب خان،ساہتیہ اکادمی نئی دہلی،پہلا ایڈیشن ۱۹۸۴ء صفحہ ۶۳

(۷)اردوے معلّیٰ:فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۳۸تا۳۹

(۸)اردوئے معلّیٰ:فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۳۸تا۳۹

(۹)اردوئے معلّیٰ:اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۵

(۱۰)اردوئے معلیٰ:آل احمد سرور،بشمول حسرت موہانی مرتبہ ثریا حسین ۱۹۵۸ء صفحہ ۳۶

☆☆☆

اردو کی ترقی کے لئے اردو کے رسائل واخبارات کو خرید کر پڑھیں
اور
اپنے بچوں کی اردو تعلیم کا انتظام ضرور کریں۔

کئی چاند تھے سرِ آسماں: ایک نفسیاتی جائزہ

ڈاکٹر معراج الدین خاں

(اسسٹنٹ پروفیسر، کسان پی جی کالج، بہرائچ 271801 (یوپی) Mob. 9026234510)

ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" اردو کا پہلا تاریخی ودستاویزی ناول ہے جس میں تاریخ فہمی اپنے پورے شباب پر ہے، اس ناول کے خالق مشہور نقاد و محقق شمس الرحمٰن فاروقی ہیں۔ فاروقی صاحب ہمارے عہد کے ایک نامور نقاد گزرے ہیں، چونکہ وہ ایک زیرک نقاد تھے، اس لیے عام طور پر جو غلطیاں دیگر لوگوں سے سرزد ہوئیں ان کے یہاں نہیں پائی جاتی، یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول میں فنی پختگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

فاروقی صاحب داستان کے باقاعدہ نقاد ہیں، انھوں نے کچھ گم شدہ اسالیب کی بازیافت کی ہے، اس طرح لسانی اور تکنیکی دونوں سطحوں پر ناول کو ایک نئی تعبیر مہیا کرتا ہے، فاروقی صاحب علم ہیں، مشرقی ومغربی ادب پر ان کی گہری نظر ہے، تنقید میں وہ مستحکم حیثیت رکھتے ہیں، وہ تنقید سے یک دم افسانوی میدان میں اتر آئے۔ "سوار" سے انھوں نے اپنے نئے تجربے کا آغاز کیا، خود کو خوب مانجھنے کے بعد ناول لکھنے کی طرف راغب ہوئے۔

اس ناول کا موضوع ہند اسلامی تاریخ وتہذیب ہے۔ اگر فاروقی صاحب نے زور دے کر اس تخلیق کو ناول نہ قرار دیا ہوتا تو اس کے صنف کے تعین میں خاصی دشواری پیش آتی، مگر فاروقی صاحب کے اس بیان کے بعد بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے:

"یہ تاریخی ناول نہیں ہے، اسے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب اور انسانی اور تہذیبی وادبی سروکاروں کا مرقع سمجھ کر پڑھا جائے تو بہتر ہوگا۔"

آصف نعیم صاحب اس کی تکنیک کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

"وزیر خانم نامی باب سے کتاب نامی باب تک ناول کا کلام Discourse ایک ارتقائی مشہود (Fortuitous Nitnes) کے رنگ میں ہے۔"

فاروقی صاحب نے ناول کی اظہاریت میں دلکش عبارت کو پیش کیا ہے اور اس ناول کا حسن بیان نہایت عمدہ ہے، اس کے علاوہ اس میں اشاروں اور کنایوں سے بھی کام لیا گیا ہے۔ ناول کا اظہارِ بیان واضح ہے اور قاری کو اندازیا قیاس آرائی سے کام نہیں لینا پڑتا ہے۔ اس ناول کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے اقبال مجید صاحب فرماتے ہیں:

"فاروقی نے ناول کی اظہاریت میں عجائبات کی نمائش کے مانند دل نواز عبارت اور اشارات کو جھاڑ پونچھ کر نوادرات کی طرح پیش کیا ہے۔"(1)

ناول لسانی اعتبار سے بھی بے انتہا اہمیت کا حامل ہے، اس ناول میں مستعمل زبان کے گوں ناگوں پہلوؤں پر تفصیلی تجزیے کے لیے ایک مکمل باب کی ضرورت کی ضرورت ہے۔ اس عہد میں اردو زبان تشکیل اور تعمیر کے دور سے گزر رہی تھی، روز بروز نئے نئے تجربات عمل میں آرہے تھے، ایسے میں لفظوں اور جملوں کے استعمال میں محقق اور نقاد ناول نگار فاروقی نے پھونک پھونک کر قدم رکھا، بقول انتظار حسین:

"یہ ناول ایک ایسے شخص کے قلم سے جسے اول اول ہم نقاد و محقق کی حیثیت سے جانتے ہیں، شمس الرحمٰن فاروقی نے بطور ناول نگار خود کو منکشف کیا ہے مگر یہ انکشاف حیران کن ہے کیوں کہ انگریز حاکمان بہادر کی زبان افواج وسپاہ کی زبان امراء ورؤساء کی زبان بادشاہوں کی زبان شعراء وعوام الناس کی زبان کے استعمال میں واضح طور پر امتیاز قائم کر کے رکھنا نہایت مشکل اور ناممکن عمل ہے۔ یہ کام فاروقی جیسا شخص ہی انجام دے سکتا تھا۔"

ناول میں مختلف مقامات کی نسبت سے جدا جدا محاورات کا استعمال کیا گیا ہے، بیگماتی زبان میں نسائیت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ یہ ناول تاریخ سماج، تہذیب ومعاشرہ نیز اقتصادی و معاشی پہلوؤں پر گہری بصیرت افروزی کے علاوہ زبان وبیان اور فنی محاسن کے لیے بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، انھیں خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے انتظار حسین لکھتے ہیں:

"مدتوں بعد اردو میں ایک ایسا ناول آیا جس میں ہند و پاک کی ادبی دنیا میں ہلچل مچادی ہے، کیا اس کا مقابلہ اُس ہلچل سے کی جائے جو امراؤ جان ادا نے اپنے وقت میں پیدا کی تھی۔"(2)

ناول کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے افضال احمد سید کہتے ہیں:

"اگر یہ ناول نہ ہوتا تو ہمیں کچھ بھی نہ معلوم ہوسکتا کہ ہند اسلامی دنیا اور بالخصوص دلی کی دنیا انیسویں صدی میں واقعی بھلا کس طرح کی تھی اور کیسی تھی؟"

اور دور حاضر کے مشہور ناول نگار مشرف فاروقی کہتے ہیں:

"یہ ناول مجھے اندر سے بدل کر رکھ دیتا ہے اور ان چیزوں کے لیے دل میں ایک زبردست ہوک پیدا کرتا ہے جنھیں ہم کھو چکے تھے اور جن کی بازیاب کی امید بھی ہمیں نہ تھی۔"

ان کے علاوہ اسلم فرخی کا خیال ہے کہ:

"کئی چاند تھے سرِ آسماں اکیسویں صدی کی ہی نہیں اردو فکشن کی بہترین کتاب ہے۔"

کئی چاند تھے سرِ آسماں ایک ایسا ناول ہے جو حقیقت اور فکشن کے درمیان واقع ہے، اس قسم کے آمیزے تخیل کی زبردست قوت کا تقاضا کرتے ہیں، فاروقی صاحب نے حقیقی اشخاص اور واقعات کو اخذ کیا ہے لیکن ان کے اردگرد کی تفصیلات کے لیے زیادہ سے زیادہ تخیلی رنگ آمیزی کو ترجیح دی ہے، اور پورے اعتماد اور ارادے کے ساتھ یہ کوشش بھی کی ہے کہ وہ ہو بہو ویسے ہی نظر آئیں جیسا ناول نگار انھیں تخلیق کر رہا ہے، ناول کا نام کئی چاند تھے سرِ آسماں احمد مشتاق کے شعر سے لیا گیا ہے ۔پورا شعر یوں ہے ۔

کئی چاند تھے سرِ آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے
نہ لہو میرے ہی جگر میں تھا نہ تمھاری زلف سیاہ تھی

855 صفحات پر مشتمل یہ ناول تقریباً سوا سو سال کے زمانے پر محیط ہے ، ناول کا اختتام 1856ء کے اواخر میں ہوتا ہے۔ ناول کی اصل کہانی ڈرامائیت اور طلسماتی ماحول میں شروع ہوتی ہے، کڑیوں سے کڑیاں ملانے کی کوشش میں چار ابواب صرف کیے گئے ہیں۔ پہلے باب میں ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی ماہر امراض چشم کی یادداشتوں کی بنا پر ناول کے مرکزی نسوانی کردار وزیر خانم کا اجمالی تعارف پیش کیا گیا ہے ۔اسی باب میں وزیر خانم اور مارسٹن بلیک کی اولادوں سے بھی تعارف کرادیا جاتا ہے۔ وزیر خانم کی بیٹی سوفیہ کی واحد نرینہ اولاد وسیم جعفر سے خلیل اصغر فاروقی کی ملاقات اتفاقیہ طور پر لندن کی برٹش لائبریری میں ہوتی ہے۔

وسیم جعفر اپنے آباء واجداد کی تلاش میں محو رہتے تھے ایک دن برٹش لائبریری کے تہ خانے میں انھیں اپنی پردادی وزیر خانم کی شبیہ خیالی حاصل ہوجاتی ہے جسے ولی عہد سوئم مرزا غلام فخر الدین بہادر نے وزیر خانم سے شادی سے قبل دلی کے مشہور نقاش میاں غلام علی سے بنوائی تھی ، اس تصویر کے سہارے وسیم جعفر کو وزیر خانم کی شخصیت اور سیرت کا تانا بانا تیار کرنے میں مدد ملتی ہے، یہ دلچسپ بات ہے کہ تصویر ہو بہو سو سال پرانی میاں مخصوص باللہ کی بنائی ہوئی بنی ٹھنی کی تصویر سے بھی حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہے،؛ لندن سے واپسی بعد خلیل اصغر فاروقی کو وسیم جعفر کے انتقال کی خبر کے ساتھ ان کا ترکہ بھی موصول ہوتا ہے جس میں سے ایک طلسماتی کتاب برآمد ہوتی ہے جسے پڑھنے کی کوشش میں صدی کے عظیم ناول کی کہانی کی پرتیں خود بخود کھلنے لگتی ہیں۔ راجستھان کے کشن گنج کے گاؤں ہندل ولی کی معروف شبیہ سازوں ، مصور اور صوفی میاں مخصوص باللہ کے ذکر سے ناول کی کہانی آگے

بڑھتی ہے۔

فاروقی صاحب نے پورے ناول کو چھوٹے چھوٹے عنوان سے بانٹ دیا ہے اس سے ناول کو سمجھنے میں کافی آسانی ہوتی ہے، ناول کا سب سے پہلا عنوان وزیر خانم جس کو ناول نگار نے ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی کی یادداشتوں کے سہارے پیش کیا ہے ۔وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم محمد یوسف سادہ کار کی تیسری اور سب سے چھوٹی بیٹی تھی، وزیر بیگم کی پیدائش دلی میں ہوئی تھی، محمد یوسف سادہ کار اصلاً کشمیری تھے ،وہ کشمیر سے دلی کیسے آئے اس کی تفصیلات کہیں نہیں ملتی ہیں۔

وزیر خانم باری باری سے کئی لوگوں کے نکاح میں آتی ہیں اور مصنف کے نزدیک مارسٹن بلیک(Morston Black)ان کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا لیکن کچھ لوگ نواب شمس الدین احمد خان کو ان کا پہلا شوہر مانتے ہیں، وزیر خانم کے مارسٹن بلیک سے دو بچے ہیں ایک لڑکا مارٹن بلیک (Mortin Black) عرف امیر مرزا اور ایک لڑکی سوفیہ(Shofia) مسیح جان عرف بادشاہ بیگم کی ماں تھیں ۔مصنف نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ کیسے ایک پردہ نشین مسلمان لڑکی ایک انگریز کے استعمال میں آتی ہے۔

ناول کا دوسرا عنوان سوفیہ ہے۔اس باب میں مختصر مارسٹن بلیک کے خاندان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس باب میں انگریزوں کی فطرت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔انگریزوں نے بہت سارا مال ہندوستان سے اڑا کر اپنے عجائب گھروں، ذاتی حویلیوں، کوٹھیوں وغیرہ میں رکھا ہوا ہے۔ ان کو بہت سا مال تو تحفے میں بھی ملا ہے اور بہت سی چیزیں انھوں نے عیاری، جبر واستحصال سے حاصل کرلیں۔انگریزوں کی کرتوت ملاحظہ ہو:

"وہ بھلا کیوں بیچے گا ؟ کیا عبدالحمید لاہوری کا بادشاہ نامہ انگریزوں نے واپس کیا؟ کیا کوہِ نور ان لوگوں نے واپس کیا؟"(3)

وزیر خانم کی زندگی میں یکے بعد دیگرے چار مرد آئے اور قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ کوئی رفاقت نہ نبھا سکا اور وہ آخر تک تنہا رہیں ،وزیر خانم پندرہ سال کی عمر میں کیپٹن ایڈورڈ مارسٹن بلیک کی رکھیل ہوئیں، وہ درمیانی درجہ کا فرنگی نوآبادیاتی فوجی افسر تھا، اس کے بعد وزیر خانم مشہور اردو شاعر داغ دہلوی کی ماں بنیں، جب وہ فیروز پور، جھروکہ اور لوہارو کے نواب شمس الدین احمد خاں کے حرم داخل تھیں، اس کے بعد رام پور کے آغا تراب علی سے ان کی با قاعدہ شادی ہوئی ،اور آخر میں مرزا فتح الملک بہادر جو آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے وارث تھے، ان کی بیگم بنیں۔فاروقی صاحب "فرسٹ سٹی میگزین" کو انٹرویو دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"متن خاص طور پر بیانیہ متن اپنا آقا یا مالک خود ہوتا ہے اور مصنف کو نکیل ڈال کے لے چلتا ہے تاہم جب میں نے غور کیا تو مجھ پر کھلا کہ وزیر خانم اور اس کی دلی ایک دوسرے کا ہو بہو عکس تھے، دونوں کے پاس سب کچھ تھا یعنی کلچر، نفاست، علمیت اور اعلیٰ ذوق ۔اپنے مجرد مفہوم میں لیکن کچھ بھی ان کے سود مند نہیں ہوا۔دہلی ایک فرسودہ متروک اور ناخواندہ شہر ہی نہیں تھا جیسا کہ نوآبادکاروں اور ان کے مقتدر دانشوروں نے کہا ہے ، وزیر خانم من موجی اخلاق سے عاری رنڈی نہیں تھی۔جیسا کہ اسے معمولاً پیش کیا گیا ہے۔"(4)

فاروقی صاحب ماہر نفسیات ہیں ۔ناول میں جگہ جگہ اس کے اشارے ملتے ہیں ، ازدواجی زندگی کے لیے جنسی آسودگی ضروری ہے، مارسٹن بلیک اس کام میں ماہر تھا، ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

"اور کچھ نہیں تو طور عشق وعاشقی نے مارسٹن بلیک بہت تجربہ کار، منجھا، سدھا اور چھوٹی بیگم کی ہر خواہش، ہر ضرورت کو بخوبی سمجھنے والا اور بوجوہ احسن پورا کرنے والا مرد ضرور تھا وہ اسے اتنا پریشان کبھی نہ کرتا کہ وہ گھبرا جائے یا منھ پھیر لے یا بیزار ہو، اور نہ ہی وہ اس سے ایسا فاصلہ برتتا کہ اس کے دل میں الجھن ہونے لگتی کہ اب وہ کب میری طرف دیکھے گا، خواہش کی گاڑھی خوشبو کب اس کے بدن سے اڑتی اڑتی مجھ تک آئے گی، مارسٹن بلیک کو کچھ ایسا گُر معلوم تھا وہ خود از خود سمجھ لیتا کہ آداب بستر کے اعتبار سے چھوٹی بیگم کے ساتھ کب کس طرح برتاؤ کیا جائے ،وہ جبلی طور پر سمجھ لیتا تھا کہ کب میرا خیر مقدم گرم جوشی سے ہوگا اور جب دونوں طبیعتیں حاضر ہوتیں تو کم وبیش ساری ساری رات نہ وہ تھکتا اور نہ یہ گھبراتی۔"(5)

فاروقی صاحب آگے آداب زندگی سے متعلق بتاتے ہیں کہ عام طور پر مرد ان تمام باتوں سے ناواقف ہوتے ہیں اور اپنی من مانی

کرتے ہیں ، فاروقی صاحب نے وزیر خانم کے حسن و جمال کا دلکش خاکہ کھینچا ہے، ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

"سونے سے کام سے دمکتا ہوا آسمانی دوپٹہ ،انگیا کا دودھیا رنگ اور کرتی کا سفید رنگ اور اس پر وزیر کا دمکتا ہوا سانولا چہرا، سیاہ آنکھیں جن کی کاجل کی بہت ہلکی تحریر، انگیا اور کرتی کے گور گریباں سے اٹھتی ہوئی سڈول گردن رنگوں کا ایسا نظارہ دل کو بھلا لگتا اور آنکھوں میں پھبتا ہوا امتزاج یوسف علی خاں جیسے تجربہ کار حسن شناس کو بھی سناٹے میں ڈال دیا۔"(6)

شمس الدین احمد نے ہم آغوشی کے درمیان وزیر کے سراپا کو کچھ یوں محسوس کیا، اس کی تفصیل نواب کے ذہن میں نشہ کی کیفیت پیدا کرنے والی تھی۔

" وزیر کا قد اوسط درجہ سے ذرا نکلتا ہوا تھا لیکن وہ ایسی بدن چور تھی کہ کپڑے پہن کر بالکل دھان پان لگتی تھی ، کپڑوں کے بغیر بھی وہ دبلی پتلی لیکن کامنی اور ولاسنی معلوم ہوتی تھی ، کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو متوازن سڈول اور اپنے موقع کے اعتبار سے بھاری باریک اور تنگ نہ ہو ،اور نزاکت میں کہیں تقصیر نہ تھی۔"

ناول میں اس کے بعد ولیم فریزر کا ذکر آتا ہے، وزیر خانم صرف کئی چاند تھے سر آسماں کی ہی نہیں بلکہ اردو کے افسانوی ادب کے نمائندہ نسوانی کردار کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرانے میں کامیاب ہوتی ہے، فاروقی صاحب کی صناعی نے وزیر خانم کو زندہ جاوید بنادیا ہے ، وہ انارکلی کی طرح مظلوم ہوکر بھی ناول کے کوائف وحالات کے رخ کو متحرک رکھتی ہے۔ امراؤ جان ادا کی طرح وزیر خانم بھی شاعرہ ہے، اور زہرہ تخلص کرتی ہے مگر امراؤ جان کی طرح مردوں کے سامنے اپنی بے بسی ظاہر نہیں ہونے دیتی ، آگ کا دریا کی چمپا سے بھی زیادہ متحرک ہے ، دہلی کا رزیڈنٹ ولیم فریزر وزیر کو اپنے حرم میں داخل کرنے کا متمنی ہے مگر وزیر مضبوط لہجے میں کہتی ہے:

"نواب رزیڈنٹ بہادر وہ راگ نہ چھیڑیں جن کے ساز آپ کے پاس نہ ہوں۔"

ناول نگار نے وزیر خانم اور نواب شمس الدین احمد خاں کی وابستگی پر تقریباً تین سو صفحات صرف کیا ہے، یہ حصے ناول کے بہترین صفحات پر شمار کیے جاسکتے ہیں کیوں کہ اس سے ہندوستان کے زوال پذیر دور کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مصنف کا ادراکی شعور کافی تیز ہے، وزیر خانم کے مزاج اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل اقتباس معاون ثابت ہوگا:

" اسے اپنی تکمیل کے لیے مرد کی ضرورت نہ تھی ، مرد کے زریعہ وہ اپنی شخصیت اور وجود کا اثبات چاہتی تھی ،اس کا گمان تھا کہ اگر دنیا میں محبت کہیں ہے تو وہ عورت کے لیے ہے یعنی عورت چاہے اور اپنی مرضی کے علاوہ کسی کی پابند نہ ہو، وہ کہتی تھی کہ مرد چاہتے نہیں ہیں وہ چاہے جانے کے احساس کے دلدادہ ہیں۔"(7)

ناول میں ٹھگوں کے متعلق بھی کافی معلومات ملتی ہیں اور مصطلحات ٹھگی کا ذکر کافی تفصیل سے ملتا ہے ، ناول نگار ایک جگہ نوابوں کو ذکر کرتے ہوئے پٹھانوں کے متعلق غیر ضروری عادت کا ذکر کرتے ہیں اور ان پر طنز کرتے ہیں جو نامناسب ہے۔

" آغا مرزا تراب علی کے مزاج میں ہٹ عام سے کچھ زیادہ تھی اور رام پور کے پٹھانوں میں رہتے رہتے ان کی جہالت میں کچھ اضافہ بھی ہو گیا تھا۔"(8)

فاروقی صاحب نے جہالت کو پٹھانوں سے منسوب کر کے سخت غلطی کی ہے انھیں شاید یہ علم نہیں ہے کہ مسلمانوں میں اگر کوئی قوم باطل کے سامنے ڈٹ کر مقابلہ کرنے والی ہے تو وہ پٹھان ہیں جن کی بدولت اسلام مخالف قوتیں مسلمانوں سے ٹکرانے سے گھبراتی ہیں۔

اس ناول میں کچھ چیزیں غیر حقیقی لگتی ہیں جیسے کہ بار بار وزیر خانم کا کسی سے تعلق ہونا اور اس کا اس دنیا سے رخصت ہوجانا، ان کی چوتھی شادی مرزا محمد سلطان فتح الملک شاہ بہادر عرف مرزا غلام فخر الدین عرف فخرو سے ہوتی ہے۔ کئی جگہ ان کے نام سے کچھ الجھن ہوتی ہے۔ ناول میں یہ بات بڑی عجیب نظر آتی ہے جہاں وزیر خانم کی شادی کا ذکر چلتا ہے وہیں ان کے صاحبزادے نواب مرزا کی شادی کا ذکر بھی چھڑ جاتا ہے ، جوان بیٹے کی موجودگی میں ماں کی شادی نہایت معیوب معلوم ہوتی ہے، قلعۂ معلیٰ سے پیغام آنے کے بعد وزیر خانم نہایت غور وفکر کے بعد کچھ شرطیں رکھتی ہے جن میں ان کے بچوں کی نگہداشت کا بھی ذکر ہوتا ہے، جب تمام شرائط مان لی جاتی ہیں تو وزیر خانم نکاح کو منظوری دے دیتی ہیں اور آخر کار نکاح ہوجاتا ہے۔

ناول میں وزیر خانم کے حسن اور خوبصورتی کا جہاں جہاں ذکر آیا ہے فاروقی صاحب نے

بڑی فراخدلی سے اس کی تعریف مین صفحے کے صفحے سیاہ کردئے ہیں اور کچھ چیزیں اضافی معلوم ہوتی ہیں ۔ فاروقی صاحب کا یہ کمال ہے کہ جب وہ کسی چیز کا بیان کرتے ہیں تو وہ پوری تفصیل سے اس کی جانکاری دیتے ہیں جہاں مرزا فتح الملک کا ذکر کرتے ہیں وہاں سے مغلیہ سلطنت ، اس کی تہذیب کا پورا نقشہ بیان کردیتے ہیں۔نواب مرزا داغ کے بارے میں کافی تفصیل ملتی ہے۔ان کے ذکر کے بعد سے ناول میں جگہ جگہ شعروشاعری کی محفلیں نظر آنے لگتی ہیں،ان کے بعد نواب ضیاءالدین احمد خاں ۔امام بخش صہبائی،مرزا غالبؔ وغیرہ کا ذکر بھی آیا ہے ،شاعری اور اسکے رموز پر لمبی چوڑی بحثیں نظر آتی ہیں ، ان سب کے ساتھ ساتھ مرکزی کردار وزیر خانم کی ذہنی کیفیت ، خیالات کی یلغار،خود سوالات کرنا اور ان کے جوابات تلاش کرنا یہ ساری کیفیتیں ناول میں جابجا نظر آتی ہیں ،نواب مرزا کے کردار کو سنوارنے کی کافی کوشش کی گئی ہے۔

جب وزیر خانم قلعۂ معلیٰ میں آجاتی ہیں تو مرزا فخرو اس قدر خوش ہوتے ہیں گویا وہ نوعمر ہوں اور ان کی پہلی شادی ہو اور پھر ایک بار شعر وشاعری،حسن وعشق کی باتیں لگاوٹ بھری چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے ، ناول مین ان چیزوں کی کئی تفصیل ملتی ہے،فارسی اشعار کثرت سے کوڈ کیے گئے ہیں جن میں خواجہ شیراز،خواجہ حافظ،امیر خسرو،میاں سلیم مصحفی وغیرہ کے اشعار ملتے ہیں اور اکثر اشعار جذبات کو برانگیختہ کرنے والے ہیں اور ہجر ووصال کا ذکر عام طور سے ملتا ہے ۔ ناول میں جہاں جہاں عشق ومحبت کا ذکر ہے وہاں مثنوی او داستان کے انداز بیان کا شبہ ہوتا ہے،یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"صاحب عالم وعالمیان ایک لحظے کے لیے رکے پھر انھوں نے بڑھ کر وزیر کے منھ کو ہلکا سا بوسہ دیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا،کیا آپ نے میاں سلیم کی بیت نہیں سنی ۔

ہوس چوں شیر بر اطراف آن سیمیں بدن گردد
کہ زیر دامن او دیدہ نقش پائے آہوئے؟

یہ شعر پڑھتے پڑھتے مرزا فخرو کے چہرے پر حیا کی سرخی سی دوڑ گئی ،اتنی کھلی ہوئی بات ابھی پہلی ملاقات میں ان سے کہ نہ بنتی تھی لیک سچ یہ ہے کہ وزیر خانم کی باتوں سے اب ان کا دل الجھنے لگا تھا،شعر پڑھ کر مرزا فخرو نے چاہا کہ وہ وزیر کو پوری طرح آغوش میں بھر لے،ادھر اس خفیف سے بوسے نے اور شعر کے سننے کے بعد اچانک وزیر کے سارے بدن میں حیا اور خواہش کی گرمی بھر گئی تھی، ایسا شوخ شعر تو عورتیں بھی آپس میں نہ پڑھتی ہوں گی۔"(9)

یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر ناول میں اس سے بڑھ کر جنسی خواہش کے ہیجان کا ذکر بھی پوری تفصیل سے ملتا ہے،ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

"لیکن مرزا فخرو کی زبان سے یہ شعر ادا ہونا تھا کہ وہ رسمی دھاگے یا جھاڑ پھونک کے بے حقیقت گنڈے کا سا رشتہ زناشوئی جس میں وہ خود کو اور ولی عہد سوئم کو منسلک دیکھتی تھی وزیر کے دل سے تار عنکبوت کی طرح نابود ہوگیا اس کے جسم کے عروق مردہ میں نیا کس بل نیا تناؤ آگیا ،اسے اپنی چھاتیاں کھینچتی اور تنی ہوئی سی محسوس ہوئیں ، جہاں مدتوں کی گستاخی نے سر نہ اٹھایا تھا وہاں گردن افرازی کے دو سرمئی نقطے پیدا ہوگئے گویا کسی سحر کے زور سے اس کی شرمگیں آنکھوں کا عکس وہاں پر توزن ہوگیا ہو، بسکہ پستائش سر بالا سر کشید عکس چشم کا فرش بر دے کتاد ،اس کے جی میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور گرداب آب زندگی کے نیچے چشمۂ حیواں میں نئے سرے سے آب حیات چھل بل کرنے لگا اور چشم زدن میں وہ جگہ چشمہ یا نغز زہاد میں تبدیل ہوگئی ،اب کچھ مزے پہ آیا شاید وہ شوخ دیدہ آب اس کی پوست میں ہے جو میوہ رسیدہ نقش سم آہو برسر گلبرگ روشن ہو،اور زخم دروں عاشق کی طرح وا ہونے لگا،صبح امید عاشق کے نیچے شق گشتگی قر کے آثار در پردہ پیدا ہونے لگے،لام الف میں لا کی جگہ بلا کا رنگ ہویدا ہونے لگا، دو ماہ نو جو مدتوں سے یکجا تھے اب آب نمک دان پا کر اپنی پیوستگی چھوڑنے لگے۔"(10)

مذکورہ بالا اقتباس پڑھ کر فاروقی صاحب کی زبان دانی کی داد دینی پڑتی ہے ، جس طرح انھوں نے فارسی اور اردو کو ملا کر دوآتشہ بنادیا ہے،ہم آغوشی اور صحبت سے قبل جو حرکات وسکنات ہوتی ہے جسے ہم فور پلے سے تعبیر کرسکتے ہیں جس سے مادۂ منویہ حرکت میں آجاتا ہے لیکن اس قسم کلے مناظر ناول میں نہیں بلکہ فلمی پردے پر ہی مناسب معلوم ہوتے ہیں ، فاروقی صاحب یہیں پر بس نہیں

کرتے ہیں بلکہ بہترین الفاظ اور جملوں سے عبارت کو رنگین بنا دیتے ہیں۔

"وزیر کو بالکل توقع نہ تھی کہ اب وہ قفل سرمہ گوں کبھی کھل سکے گا، وہ تو بقول انشاء اللہ خاں : ان سب چیزوں کو یکبار رو پیٹ کر بیٹھی ہوئی تھی لیکن مرشدزادہ آفاق کوئی تعویذ پہنے ہوئے تھے یا سلیم کے شعر میں کوئی موہنی پوشیدہ تھی یا پھر وزیر کی محبت ان کے جسم وجان کو اس طرح احاطہ کیے ہوئے تھی کہ وزیر کے بھی جسم وجان کو جائے فرار نہ رہی تھی، میرزا فخرو نے آہستہ آہستہ وزیر کے تلوے سہلائے ، پاؤں کی انگلیوں کو بوسہ دیا پھر چاہا کہ شاخ نسرین جیسی نازک لیکن شاخ صندل جیسی سڈول پنڈلیوں کو دریافت کریں اور ممکن ہو تو زانوؤں کے شیشہ وساگر لبریز صہبائے حسن سے جرعہ جرعہ سیراب ہوں، پنڈلیوں پر میرزا فخرو کا لمس پہنچتے ہی وزیر کی بے قراری اور بڑھی ، اس نے بے تکلف ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور سرگوشی کے لہجے میں لیکن کچھ شوخ تبسم کے ساتھ بولی کتابنوں شکاری۔

فتح الملک بہادر کی حیرانی ایک حد تک رفع ہوئی تھی ، یہ وہی آہو کا تلازمہ تھا جو خود انھوں نے شروع کیا تھا لیکن کتا؟ انھوں نے کن انکھیوں سے وزیر کو دیکھا وزیر نے کچھ آگے بڑھ کر خود کو فتح الملک بہادر کے اور بھی قریب کرلیا کہ دونوں ہم آغوش ہوگئے ، پھر اس نے اپنے پائینچے اوپر کھینچے ، ساق اور اس کی پوری خوش منظری کے سامنے میرزا فخرو کی آنکھیں چکاچوند ہونے لگیں ، وزیر نے ان کے ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیے، اب اس کا تنفس کچھ تیز ہو چلا تھا، اس نے اشارے کی زبان میں کچھ یوں کہی کہ یہ دوپٹہ اور شلوکا اور انگیا میرے بدن سے نچ جائیں تو اچھا ہوتا، میرزا فتح الملک کے ذہن میں میاں مصحفی کا پورا شعر گونج اٹھا۔

وہ آہوئے رمیدہ مل جائے تیر شب گیر
کتا بنوں شکاری اس کو بھنبھوڑ ڈالوں

اللہ اللہ کیا جرأتیں ہیں، کیا اچپلائیاں ہیں اور کیا ڈھٹائیاں ہیں ،شاہ حاتم نے تو صرف سوچا ہوگا ہم تو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، انھوں نے بآواز بلند شعر کو دادا کیا اور بولے!

چھوٹی بیگم آپ آہوئے رمیدہ کیوں ہو ؟ آپ ہمارے کنج محبت میں آسودۂ منزل ہوجائیں، ہم آپ کے رکھوالے اور آپ کے خدمت گزار رہیں گے، اور ہمارے اور آپ کے درمیان یہ لباسی پردے کیوں باقی ہیں ؟ یہ کہہ کر میرزا فتح الملک بہادر نے وزیر کا دوپٹہ کھینچ کر الگ کردیا اور اپنی قبا کے بھی تکمے کھول دئے ،وزیر نے ہاتھ آگے بڑھا کر فتح الملک کے سینے کو ٹٹولا تھوڑی دیر کے بعد شمعوں کی روشنی آپ سے آپ مدھم پڑنے لگی۔"(11)

فاروقی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور وہ علم نفسیات کے ماہر ہیں، ناول میں جا بجا مرد اور عورت کے نفسیاتی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے، فاروقی صاحب نے ایک نکتہ اٹھایا ہے کہ صحبت کرنے کے بعد مرد جب سو جاتا ہے لیکن عورت کو جلد نیند نہیں آتی ہے، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کہتی کہ مرد کو صرف اپنی غرض سے کام ہے، مطلب برآوری کے بعد وہ اس بات سے بے تعلق ہوجاتا ہے کہ میری شریک بستر کس حال میں ہے، یا پھر مرد اپنا قالب تہی کردینے کے بعد ایک چھوٹی سی موت سے دوچار ہوجاتا تھا جیسا کہ بعض بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں اور اسے دوبارہ زندگی حاصل کرنے کے لیے چھ مہلت اور کچھ راحت کی ضرورت رہتی ہے ، راحت کی بھی اچھی رہی ،وزیر اپنے دل میں کہتی گویا جو کچھ بستر پر لوٹ مار کی وہ راحت نہ تھی ، خوب!"(12)

"وہ کبھی کبھی ذرا تلخ کام ہوکر خود سے

فاروقی صاحب نے حمام کے لوازمات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور مغلیہ دور کے حمام کی خصوصیات اور اس کے حمام کے لوازمے کا ذکر کافی تفصیل سے کیا ہے، چوڑے منھ کے بانس کے دونل جن سے ٹھنڈا اور گرم پانی آتا تھا ان کا ذکر بھی کیا ہے، یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"وزیر کو یقین ہوگیا کہ اب نیند نہ آئے گی، کیوں نہ گرم پانی سے نہا کر بدن کا کسل دور کرلیجے، یہ سوچ کر وہ آہستہ سے بستر سے اٹھی، لباس سے عاری ہونے کے سبب اچھی خاصی سردی لگ رہی تھی اس نے اپنے کپڑے اٹھائے، بدن پر دوشالہ پہنا ،اور آبدار خانے میں چپکے سے داخل ہوئی، یہاں ہر طرح کے لوازم موجود تھے، انگریزی صابن، خوشبودار بیسن ،چکنی مٹی ،سر دھونے کے مصالحے ، تیل اور عطر کی پٹیاں ،جسم کو رگڑنے

اور صاف کرنے کے لیے طرح طرح کے جھانوے ،اور انگریزی اسفنج ، چھوٹی قینچی اور ناخن تراش ،بدن کو خشک کرنے کے لیے بھاری بھاری رنگین اور سادہ بھاری دستمال، نہانے کی چوکی ،صندل کی خوشبودار لکڑی کی، کئی قدآدم آئینے۔"(13)

فاروقی صاحب کے احساس جمال میں جو شدت ہے اس کا مظاہرہ بار بار کرتے ہیں، جہاں موقع ملتا ہے وزیر خانم کی ایک نئے زاوئے سے شبیہ سازی کرنے لگتے ہیں ، اس طرح انھوں نے وزیر خانم کے ایک ایک عضو، ایک ایک جنبش، ایک ایک پہلو اور ایک رخ کی تصویر کو اپنے تخیل کی غیر معمولی قوت سے کچھ اس طرح کھینچا ہے کہ ان کی سانسوں کی دھمک تک اس میں سنی جا سکتی ہے ۔جس طرح آج کل کی فلموں اور خاص کر مسالہ فلموں میں کچھ بیڈ روم سین اور باتھ روم سین ڈال کر فلم کو رنگین بنا دیا جاتا ہے اسی طرح اس ناول میں بھی مناظر پائے جاتے ہیں۔اور اس پر طرہ یہ کہ وزیر خانم کا طوائفوں جیسا انداز فاروقی صاحب کا کمال ہے کہ انھوں نے حسن کی برہنگی کو تقدس کا درجہ دے دیا ہے۔

"مرزا فتح الملک بہادر جہاں تھے وہیں ٹھٹھک کر سناٹے میں آ گئے ، سڈول کسی ہوئی سرینیں اور زانو گویا سانچے کے ڈھالے ہوئے چیتے کی سی پتلی کمر میں خم، پیٹ بالکل مسطح اور بے شکن ،اس پر فالتو چربی کیا فالتو بوٹی کا بھی نام نہ تھا، جھکی ہوئی کمر اور پیٹھ کے باعث چھاتیاں رو بہ زمین لیکن ڈھلکن یا ڈھیلے پن سے قطعاً عاری۔"(14)

وزیر خانم کے کردار تک پہنچنے میں فاروقی صاحب کو کئی زنانے اور کئی پر پیچ مسافتیں طے کرنی پڑیں، کیوں کہ وزیر خانم ایک اعتبار سے من موہنی کا دوسرا جنم ہے اور یہ دوسرا جنم نوآبادیات کے عروج اور مغلوں کے زوال کا عہد ہے ۔بنی ٹھنی کی تصویر جتنی بولتی ہے یا تصویر میں اس کے بدن کی زبان جتنی بولتی ہے وہ اتنی ہی منھ بند اور مکمل سپردگی کا نمونہ ہے۔

وزیر خانم اگرچہ محمد یوسف سادہ کار جیسے ایک پیشہ ور کی بیٹی ہے لیکن اس کے ارادے کی پختگی اور اعتماد کی توانائی کا اس کے انفراد کی تشکیل میں خاص حصہ تھا، عورت کی جسمانی سپردگی کے مانند اس کی انا اور اس کی شناخت کی سپردگی کے نہیں ہے ،وہ وفا اور ایفائے عہد کا جواب وفا و ایفائے عہد سے چاہتی ہے۔یہ تاریخ کا وہ اندوہناک دورانیہ تھا جب مغلیہ سلطنت کے تابوت میں زوال کی آخری کیل ٹھوکی جا رہی تھی اور قلعۂ معلیٰ کے باہمی رنجشوں اور سازشوں کے ماحول میں مرزا فخرو اور وزیر خانم کی رسم نکاح اور رخصتی کا انعقاد پورے اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے ۔وزیر خانم اتنے المناک مراحل سے گزر کر آ رہی تھی کہ نہ تو کسی خوش خواب کا اسے یارا تھا اور نہ کسی خوش فہمی میں تھی ، عین حجلۂ عروسی میں اس کے دریچۂ ذہن سے یہ خیال جھانکنے لگتا ہے کہ

"کیا میری سرگزشت حیات کھوئے ہوؤں اور گزرے ہوؤں کی جستجو یا ان کی یادوں ہی میں تمام ہو جائے گی۔"

وزیر خانم کو دس گیارہ برس کا ایک طویل عرصہ میرزا فخرو کی رفاقت میں گزرا، میرزا فخرو یکا یک بیمار ہوئے اور آناً فاناً جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے وزیر بیگم دہلی کو خیر آباد کہہ دیتی ہیں ، اس طرح ناول المیہ پر ختم ہوتا ہے، ناول کئی چاند تھے سرِ آسماں کئی معنوں میں دیگر ناولوں سے مختلف ہے ،اس ناول میں ان کا موضوع ہند اسلامی تاریخ کے ایک باب ، ایک بنی ٹھنی وزیر خانم جس کی بات چیت ،لب ولہجہ اعلیٰ درجہ کی طوائفوں جیسا ہے، ناول والئ فیروز پور جھرو کہ ولوہارو کے عیش وعشرت میں ڈوبے ہوئے شب وروز اور غالبؔ کی ولیم فریزر سے دوستی ، رقابت کی آگ میں پھنکتا ہوا نواب اور ولیم فریزر کے قتل کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے، ناول کہیں کہیں بوجھل ہو گیا ہے، کچھ چیزوں کی غیر ضروری تفصیلات ذہن پر بار ہو گئی ہیں، ناول میں اس عہد کا پورا معاشرہ سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے، ایک پوری تہذیب اور تاریخ کو سمیٹنا مشکل کام ہے لیکن فاروقی صاحب نے یہ کارنامہ سرانجام دیا اور یہ ناول ہندو پاک میں یکساں طور پر سراہا گیا۔

حواشی

(1) نیا دور، جولائی 2014
(2) انتظار حسین کلیات احمد مشتاق، شب خون، کتاب گھر، ص 61
(3) ص 38
(4) 17 جولائی 2013ء
(5) ص 185
(6) ص 39
(7) ص 575
(8) ص 594
(9) ص 796
(10) ص 797
(11) ص 798
(12) ص 799
(13) ص 799
(14) ص 802

☆☆☆

امیر خسرو کی پہچان

ڈاکٹر ذاکر حسین ذاکر

(شانتی نگر، مہواباری، دیوریا، یوپی۔ موبائل: 9670160786)

امیر خسرو عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اعلیٰ درجے کے سیاستداں، مورخ، موسیقی کار اور شاعر تھے۔ ان کی شخصیت میں جو انوکھا پن تھا، وہ آج بھی ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ وہ انوکھا پن ان کی شخصیت کے ہر گوشے سے نمایا ہوتا ہے۔ وہ فارسی کے بڑے شاعر تھے مگر ان کی ذہنی بالیدگی کا عکس ان کی ہندوی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ان کی فارسی شاعری اشراف کے لئے تھی، جہاں ایک سخت مقابلے میں انہیں خود کو منعکس کرنے کا دباؤ تھا۔ وہیں ان کی ہندوی شاعری ارزال کے لئے کہی گئی تھی جو سماج کے سب سے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں قیمہ فروش، سبزی فروش، زرگر، آہنگر اور گداگر وغیرہ شامل تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی ہندوی شاعری میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہاں کوئی اخلاقی پابندی نہیں تھی اور نہ کوئی جواب دہی تھی۔ انہوں نے ہندوی میں انوکھے تجربے کئے، جسے عوام نے خوب پسند کیا۔ یہ مقبولیت کی کمال انتہا ہے کہ ان کی ہندوی شاعری عوامی یادداشتوں کے سہارے نسل در نسل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔ ان کی ہندوی شاعری کا جو ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے اس میں ہندی فارسی کی تین مخلوط غزلیں، 290 پہیلیاں، 80 کہہ مکرنیاں، کچھ قوالیاں کچھ نظمیں، نسبتیں اور دوسخنہ شامل ہے۔

یہ سوچ کر حیرانی ہوتی ہے کہ اپنی زندگی میں وسیع پیمانے پر فارسی شاعری کی اشاعت کرانے والا یہ شخص اپنی ہندوی شاعری کو کیسے فراموش کر سکتا ہے۔ اس ہندوی شاعری کا جس کا وہ اول تا آخر خالق رہا ہو۔ آج ہمارے سامنے امیر خسرو کی ہندوی شاعری کی کوئی اسکرپٹ، کوئی قلمی نسخہ، کوئی مخطوطہ موجود نہیں ہے۔ جس سے ہم یہ اندازہ لگا سکیں کہ امیر خسرو کی شاعری کی ہو بہو تحریر کیسی تھی۔ میری سمجھ میں اس کی تین بڑی وجہیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی یہ کہ واقعی امیر خسرو اپنی ہندوی شاعری کو کوئی اہمیت نہ دیتے رہے ہوں اور چلتے پھرتے گاؤں کی پنہارنوں کے لئے کچھ کہہ دیتے ہوں یا محلے کی ساتن چمو بائی کے لئے کچھ کہہ دیا ہو۔ یا اپنی ہندوی پہیلیوں، دوہوں اور کہہ مکرنیوں کو لکھ کر تفریحاً اپنے دوستوں کو دے دیتے رہے ہوں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جب آج کا قاری ان کی ہندوی شاعری کو پڑھتا ہے تو وہ اس کے سحر میں گرفتار سا ہو جاتا ہے۔

ان کی ہندوی شاعری کا ایک حصہ نسبت بھی ہے۔ یہ اتنی صاف ستھری زبان میں کہی گئی ہے جو دل کو چھو جاتی ہے۔ نسبتوں میں آسان لفظوں کا استعمال کر کے گہری بات کہی گئی ہے۔

حلوائی اور بزاز میں کیا نسبت ہے؟ جواب ہے کندہ

بادشاہ اور مرغ میں کیا نسبت ہے؟ جواب ہے تاج

گوٹے اور آفتاب میں کیا نسبت ہے؟ جواب ہے کرن

دیکھنے میں یہ صنف بہت معمولی ہے۔مگر اس کی تخلیق غیر معمولی ہے اور وہ ذہنی خلاقی کا متقاضی ہے۔اسی طرح انہوں نے دوسخنہ کہا۔یہ چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں، جن میں بڑا انوکھا پن ہے۔تازہ ترین صنف میں اسے ہائکو کہا جا سکتا ہے۔ان میں دو سے تین مصرعے استعمال کئے گئے ہیں۔مگر ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے اس انسان نے اسے تحریر کرتے وقت کتنی خلاقی کا استعمال کیا ہے۔پنڈت کیوں نہ نہایا؟

دھوبن کیوں ماری گئی؟ جواب۔دھوتی نہ تھی۔

روٹی جلی کیوں؟

گھوڑا اڑا کیوں؟

پان سڑا کیوں؟ جواب۔پھیرا نہ تھا۔

جورو کیوں ماری؟

اکھ کیوں اجاڑی؟ جواب۔رس نہ تھا

اسی طرح انہوں نے نہایت سادے الفاظ میں فارسی ہندوی دوسخنہ کہا ہے۔جیسے

درجہنم چیست؟ کامی کو کیا چاہئے؟ جواب۔نار

قوت روح چیست؟ پیاری کو کب چاہئے۔ جواب سدا

لیکن انہوں نے کہہ مکرنیوں میں تو کمال ہی کر دیا ہے۔اس طرح کی شاعری ایک ذہین انسان ہی کر سکتا ہے۔

مکھ میرا چومت دن رین
ہونٹن لگت کہت نہ بات
جا سے میری جگت میں پت
اے سکھی ساجن نا سکھی نتھ

ساری رین مورے سنگ جاگا
بھور بھئے تب بچھوڑن لاگا
واکے بچھڑت پھاٹے ہیا
اے سکھی ساجن نا سکھی دیا

چونکہ ان کی ہندوی شاعری عوامی تھی اور سماج کے نچلے طبقے کے لئے کہی گئی تھی اس لئے انہوں نے اس کی اشاعت کی ضرورت نہ سمجھی ہو۔یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔مگر دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ امیر خسرو کی وفات کے سو سال کے اندر انہیں صوفی کے زمرے میں شامل کر دیا گیا تھا۔مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ سازش تھی۔ایک خالص دنیا دار انسان کو تصوف کے دائرے میں شامل کرنے سے جن کئی طرح کی مشکلات نے جنم لیا۔اس میں ان کی ہندوی شاعری ایک بڑی رکاوٹ بن کر ابھری۔جو لوگ انہیں صوفی کہہ رہے تھے ان کے لئے ان کی ہندوی شاعری کو قبول کرنا بہت دشوار تھا۔ کیوں کہ وہ ارزال کے لئے لکھی گئی تھی اس لئے اس میں طبقہ اشراف کے تمدنی معیار کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اگر وہ صوفی تھے تو اس طرح کی اخلاقی حدوں سے گری ہوئی شاعری کر ہی نہیں سکتے تھے۔ان کی ہندوی شاعری میں عورت مرد کے تعلقات کے حوالے سے جنسی لفظیات کا جس انداز سے استعمال ہوا ہے وہ ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے۔کچھ لوگوں نے ان کی ہندوی شاعری پر فحاشی کا الزام بھی لگایا ہے۔لیکن یہ مسئلہ ہماری بحث سے خارج ہے۔

تو ان لوگوں نے جنہوں نے ان کا مزار بنوایا اور چادریں چڑھانا شروع کیا اور ان کے مزار پر لوبان کا دھنواں دکھاتے رہے۔کالے لباس میں قبر پر موجود ایک شخص مور کا پر لئے زائرین کو دعائیں دینے لگا۔ایسے تمام لوگوں کے لئے امیر خسرو کی ہندوی شاعری ناقابل برداشت تھی۔یہ لوگ اسے غطر بود کرنے میں لگ گئے۔

امیر خسرو کی ہندوی شاعری کے غائب ہونے کی تیسری وجہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے orientalist بھی ہو سکتے ہیں، جو اٹھارہویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ملک کی مختلف لائبریریوں میں گھوم گھوم کر فارسی ،عربی اور ہندوی کے مخطوطوں، قلمی نسخوں اور بیاضوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ان میں ایک اہم شخص ڈاکٹر اسپرنگر تھا اور کرنل جیمس ٹوڈ جیسا سیاح تھا جو سینکڑوں کی تعداد میں مخطوطات اور قلمی نسخوں کو انگلینڈ پہنچایا۔اسپرنگر دس سال ہندوستان میں رہا۔حیدرآباد لکھنؤ اور دلی میں اپنی تعیناتی کے زمانے میں اس نے تمام لائبریریوں کو چھان مارا۔وہ جب جرمنی واپس گیا تو ایک اندازے کے مطابق اس کے پاس مختلف زبانوں کے 1972 نادر مخطوطے موجود تھے۔ہوسکتا ہے ان میں امیر خسرو کے ہندوی کلام کے مخطوطے بھی رہے ہوں۔کیوں کہ 1980 کے آس پاس پروفیسر گوپی چند نارنگ کو اسپرنگر کے بنڈل سے امیر خسرو کی پہیلیوں کا ایک مخطوطہ مل گیا تھا جسے انہوں نے 1984 میں بہت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔یہ گوپی چند نارنگ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔آج

چالیس سال کے دوران اسپرنگر کے نسخے کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اسی طرح امیر خسرو کا شاہکار خالق باری کا مسئلہ ہے۔خالق باری ہندوی فارسی کی مخلوط لغت ہے۔یہ امیر خسرو کا ایسا کارنامہ ہے جس میں ان کی فنی صلاحیتیں اپنے عروج پر نظر آتی ہیں۔وہ جس فنکاری' صناعی اور اختراع کے لئے جانے جاتے ہیں خالق باری اس کا بہترین نمونہ ہے۔علی گڑھ کالج کے لکچرر مولانا امین عباسی چریاکوٹی نے خالق باری میں شامل 195 اشعار کو جواہر خسروی میں شامل کر کے 1918 میں شائع کیا تھا۔ خالق باری کے متعلق مولانا شبلی نعمانی نے اوحدی کرمانی کے حوالے سے کہا ہے کہ اس کی کئی جلدیں تھیں جو امتداد زمانہ میں غائب ہو گئیں۔مگر آج جو خالق باری ہمارے سامنے موجود ہے اس میں 1200 الفاظ ملتے ہیں۔ان میں چار ترکی' 236 عربی' 480 فارسی اور 475 ہندوی کے الفاظ شامل ہیں۔

امیر خسرو کی شخصیت میں کئی پرتیں ہیں۔انہیں پلٹتے جایئے تو اس میں کئی الگ الگ دروازے نظر آئیں گے جو ہم کو الگ الگ دنیاؤں کی سیر کراتے ہیں۔جیسے ان کی شخصیت کا ایک اہم حصہ دلی سلاطین سے ان کے تعلقات پر مبنی ہے۔ان کی شاعری کی طرح سلاطین سے ان کے تعلقات کی کہانی بھی ان کی ذہنی خلاقی سے مربوط ہے۔انہوں نے سات سلاطین اور چار امیر زادوں کے ساتھ اپنی کامیاب درباری زندگی گزاری تھی۔ایسے ماحول میں جہاں بیٹا باپ کو قتل کر کے تخت شاہی پر قبضہ جما لیتا تھا۔امیر خسرو بغیر کسی جھجک کے دونوں سے اپنے بہتر تعلقات بنائے رکھنے میں کامیاب ہوتے تھے۔محمد مجیب نے بھلے ہی اس فعل کو اچھی شاعری کے لئے نامناسب کہا ہو مگر امیر خسرو جس ماحول میں رہ رہے تھے وہاں وفاداریوں کا کھلا اظہار موت کو دعوت دینا تھا۔جب بھتیجہ چچا کا وفادار نہیں تو امیر خسرو کو کیا پڑی تھی کہ وہ کسی ایک کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کر کے اپنی جان خطرے میں ڈال دیتے۔ان سے تیس سال چھوٹا نوجوان تاریخ داں ضیاالدین برنی دلی کی سڑکوں پر اکثر امیر خسرو کی اس رنگت بدلنے والی ادا پر ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ایسے میں ضیا برنی کے طنزیہ فقروں کو نظر انداز کر کے امیر خسرو آگے بڑھ جاتے تھے۔

ان کی درباری زندگی میں کئی بار ایسے لمحے آئے جب ان کی جان جا سکتی تھی۔مگر ہر بار انہوں نے اپنی تیز دماغی سے خود کو بچا لیا۔ جلال الدین خلجی کے عہد میں وہ دلی کے طاقتور امیر تھے۔وہ سلطان کے منظور نظر تھے اور سلطان انہیں بے انتہا اہمیت دیتا تھا۔ یہاں امیر خسرو کو اندازہ نہیں ہوا کہ جلال الدین خلجی کا بیٹا ارکلی خاں اگلا سلطان نہیں بن پائے گا۔ جلال الدین خلجی کو راستے سے ہٹا کر علاؤالدین خلجی دلی کے تخت کا مضبوط دعوے دار بن گیا۔امیر خسرو تیزی سے بدل رہے غیر یقینی صورت حال سے حیران رہ گئے۔جلال الدین خلجی کے قتل اور علاؤالدین خلجی کی تخت نشینی میں 6 ماہ کا وقفہ تھا۔اس دوران اپنی وفاداریوں کے کھلے اظہار کے نتیجے میں کئی امیر جاں بحق ہو گئے۔مگر امیر خسرو ان احمقوں میں شامل نہیں ہوئے۔علاؤالدین نے دلی کو اپنے جاسوسوں سے پاٹ دیا تھا۔جس کسی نے بھی جلال الدین خلجی سے ذرا بھی ہمدردی کا اظہا کیا اس کی اطلاع علاؤالدین تک پہنچ جاتی تھی اور اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔لیکن کمال فن کاری سے اس پرآشوب دور میں امیر خسرو مسلسل مسکراتے رہے۔ضیا برنی اور دوسرے لوگ یہ توقع کر رہے تھے کہ امیر خسرو اپنے اتنے بڑے محسن کے بہیمانہ قتل پر کوئی مرثیہ لکھیں گے یا کوئی تعزیتی نظم کہیں گے۔مگر انہوں نے اپنی زبان سے اف تک نہ کی۔

اس سے قبل بھی غیاث الدین بلبن کی وفات کے بعد جب دلی میں تخت نشینی کی بحرانی کیفیت پیدا ہوئی تو وہ پٹیالی چلے گئے اور وہاں چار سال رہے۔جب دلی کے حالات پوری طرح سازگار ہو گئے تو واپس آئے مگر پھر بھی وہ دربار سے دور ہی رہے۔سلطان معزالدین کیقباد کو جب خبر ہوئی کہ امیر خسرو دہلی میں موجود ہیں تو اس نے انہیں بلوا بھیجا۔اس نے امیر خسرو سے ایک ایسی کتاب لکھنے کی فرمائش کی جس سے دنیا میں اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے۔امیر خسرو نے 6 ماہ خرچ کر کے اپنی یادگار مثنوی نہہ سپہر لکھی۔

ان کی کامیابی یہ تھی کہ وہ کبھی تخت کے کسی ایک دعویدار سے ہمدردی کا اظہا نہیں کرتے

تھے۔ بلکہ اس دوران وہ روپوش ہو جاتے اور جب کوئی ایک گروہ کامیاب ہو کر تخت نشین ہو جاتا اس کے بعد ان کا قصیدہ اس کے استقبال کے لئے حاضر رہتا۔ پھر تخت نشین یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہتا کہ دنیا میں اس کا امیر خسرو سے زیادہ وفادار کوئی دوسرا بھی ہو سکتا ہے۔

امیر خسرو کا تصوف شیخ المشائخ حضرت نظام الدین اولیا سے گہری وابستگی کا متقاضی ہے۔ یہ دو اعلیٰ درجے کے ادیبوں اور دانشوروں کی دوستی کا نتیجہ تھا۔ جس کا محور علم پرستی پر مبنی ہے۔ ایک بہت بڑا عالم اور دانشور تھا جو شاعر ہو گیا اور دوسرا بہت بڑا عالم اور دانشور تھا جو عظیم صوفی ہو گیا۔ اگر حضرت شیخ کی ملاقات بابا فرید سے نہیں ہوئی ہوتی تو وہ کسی شہر یا کسی خطے کے قاضی ہوتے۔ حضرت شیخ نے دہلی کے باکمال اساتذہ سے ادب' فقہ' حدیث اور علم الکلام کا درس لیا تھا۔ انہوں نے قرآن حفظ کیا' حدیث کی سب سے بڑی کتاب مشارق الانوار بھی پوری حفظ کر لی۔ وہ علم الکلام میں مہارت حاصل کر کے شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ دلی میں حضرت شیخ کی مالی حالت بدایوں سے بھی خراب ہو گئی تھی ۔لیکن ان کی تعلیم بہت اچھی ہوئی۔ دونوں ماں بیٹے مسلسل فاقہ کرتے تھے۔ فاقہ کشی نے شیخ کی علمیت میں فقر وغنا کے عنصر کو مزید تقویت بخشی ۔ایک وقت ایسا آیا جب وہ کہیں نوکری کر لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے استاد اور مستور الحال صوفی شیخ نجیب الدین متوکل سے گزارش کی کہ وہ انہیں کہیں کر قاضی کے عہدے پر تعیناتی دلوا دیں۔ متوکل نے ان سے کہا تم قاضی نہیں کچھ اور بنو اور انہوں نے حضرت شیخ کو اپنے بڑے بھائی بابا فرید سے اجودھن میں ملنے کی ہدایت کی۔

حضرت شیخ امیر خسرو کی ذہانت سے بہت متاثر رہتے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ خسرو دنیادار انسان ہے۔ اس لئے وہ اکثر اپنے دوست کو عبادت الٰہی میں غرق رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ امیر خسرو کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔ یہ دوستی کسی غرض اور طلب سے بالاتر تھی۔ اکثر محفلوں میں سر جھکا کر بیٹھنے والے شیخ جب خسرو کو آتا دیکھتے تو سر اوپر کر کے مسکرا دیتے اور اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کرتے۔ لوگ جو آس پاس بیٹھے ہوتے ان کے لئے جگہ بنا دیتے۔

حضرت شیخ پر شہد کی مکھیوں کی طرح منڈلانے والے ان کے عقیدت مند اور مریدین کے لئے یہ بات حیران کرنے والی تھی کہ حضرت شیخ خسرو سے اتنی گہری محبت کرتے ہیں۔ ایک بار شیخ نے کہہ دیا کہ اگر آری سے ان کا سر چیر دیا جائے تو بھی وہ خسرو کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ ایک بار خسرو کافی دنوں تک پٹیالی میں رہ گئے تو انہوں نے کہا کہ جی چاہتا ہے کہ پٹیالی چلا جاؤں جہاں ان دنوں خسرو قیام پذیر تھے۔ یہ سن کر ان کے مریدین حیرت زدہ رہ گئے۔ ایک بار انہوں نے کہہ دیا کہ اگر شریعت اجازت دیتی تو وہ خسرو کو اپنی قبر میں دفن کرنے کی وصیت دیتے۔ یہ کچھ ایسی باتیں تھیں جو خسرو کو عام صوفیوں کے مرتبے سے بلند کرتی ہیں۔

ان دنوں فارسی کے شعرا کے یہاں صوفیانہ شاعری کرنا عام چلن میں تھا۔ یہ ان دنوں کی فارسی شاعری کا خاص رجحان تھا۔ درجنوں فارسی شعرا صوفیانہ شعر کہہ رہے تھے۔ ان میں انوری' منوچہری' خاقانی' حکیم سنائی' فریدالدین عطار' شیخ احمد جام' جلال الدین رومی' کمال اصفہانی' نظامی گنجوی اور شیخ سعدی جیسے عظیم اور باکمال شعرا تصوف' سلوک اور معرفت پر شعر کہہ رہے تھے۔ ان کی شخصیت میں کہیں نہ کہیں دنیا سے بے رغبتی ضرور ہو سکتی ہے مگر یہ قطعی طور پر دعوا کرنا کہ وہ صوفی بھی تھے اس لئے صوفیانہ شعر کہہ رہے تھے شاید مناسب نہ ہو۔ امیر خسرو کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ ان کے سینکڑوں اشعار عرفان الٰہی اور فقر وغنا پر مبنی ہیں مگر ان کی ہندوی شاعری اس perception کو توڑتی ہے۔ ان کی ہندوی شاعری کا انداز ان کی شخصیت کو بالکل منفرد کر دیتا ہے۔ اس لئے ان کو صوفی ماننے والے پل صراط پر کھڑے رہ جاتے ہیں ۔ یا تو وہ حضرت شیخ سے ان کی نزدیکی کی بنا پر انہیں صوفی کہیں یا ہندوی شاعری کی بنا پر ان کے تصوف کو رد کر دیں۔ لہذا بعد میں اس کشمکش کو دور کرنے کے لئے ملفوظات کی ایک نقلی کتاب افضل الفوائد مرتب کی گئی اور امیر خسرو کو صوفی بنا کر ان کی شخصیت کی رنگا رنگی پر قدغن لگایا گیا۔ ورنہ

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
(میں عشق کا مارا کافر ہوں مجھے مسلمانی سے کیا غرض ہے۔ میرے جسم کی ہر رگ تار بن گئی ہے مجھے جنیؤ سے کوئی غرض نہیں ہے۔)
اس طرح کا شعر کہنے والا شاعر قطعی طور پر صوفی نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح ان کی شخصیت کا ایک شاندار پہلو ان کی موسیقی دانی ہے۔ موسیقی میں مہارت بھی خسرو کی ذہانت سے مربوط ہے۔ امیر خسرو کو ہندایرانی موسیقی میں مہارت دلانے میں سلطنت عہد کی مشہور مغنیہ ترمتی خاتون کا تعاون اہم ہے۔ ترمتی خاتون خراسان کے خنیا گر قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ غیاث الدین بلبن کے دور میں دہلی آئی تھی اور اس سے امیر خسرو کی ملاقات ملک چھجو کی محفل رقص وسرود میں ہوئی تھی۔ بعد میں امیر خسرو نے ترمتی خاتون کو جلال الدین خلجی کے دربار میں امیر مغنیہ کے طور پر تعیناتی دلوادی۔ ترمتی خاتون ایرانی موسیقی میں ماہر تھی اور امیر خسرو ہندوستانی موسیقی میں مہارت رکھتے تھے۔ امیر خسرو نے ترمتی خاتون کے اشتراک سے جس موسیقی کو فروغ دیا اس نے ہندوستانی عوامی موسیقی میں نیا مقام حاصل کیا۔ انہوں نے ایرانی اور ترکی راگوں کے اشتراک سے ایک درجن راگوں کی تخلیق کی۔ انہوں نے مجیر، سازگری، ایمن، عشاق، موافق، غنم، زیلف اور فرغانہ جیسے راگ تیار کیا۔ انہوں نے خیال، قول، قلبانہ، نقش وگل، سوہلا، منڈھا، ترانہ اور تروٹ جیسی راگنیاں بھی بنائیں۔ ان راگ راگنیوں میں انتہائی نرمی نزاکت اور لطافت پائی جاتی ہے۔ ان میں گائے گئے ہندوی گیت، غزل اور قوالیوں کے بول دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ آج بھی عوامی موسیقی کے استاد بقیہ راگ تو نہیں لیکن خیال میں اپنی ٹھمری اور دادرا انتہائی پرکشش انداز میں پیش کرتے ہیں۔

موسیقی کے سازوں میں امیر خسرو کی جدت نے بھی کمال کا درجہ حاصل کیا ہے۔ امیر خسرو کے نام سے جو ساز منسوب ہیں وہ کوئی نئے نہیں ہیں۔ قدیم ہندوستانی موسیقی میں ان سازوں کا استعمال ہوتا رہا ہے مگر امیر خسرو نے ان میں نئی جان پھونک دی۔ اگر ہم ستار کا ذکر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ستار کسی نہ کسی شکل میں نہ صرف ہندوستانی بلکہ عالمی موسیقی میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ ہندوستان میں وینا سے ترغیب لے کر ستار بنایا گیا۔ امیر خسرو نے ستار کو زیادہ پرکشش، حسین اور رومانی بنا کر پیش کیا۔ ہر زمانے میں موسیقی کار ستار کے تاروں کو گھٹا بڑھا کر اپنی ضرورت کے مطابق تیار کر لیتے تھے۔ مغل عہد میں تان سین کے بیٹے امرت سین نے ستار کے تاروں میں تین تار بڑھا دیا۔ اس کے بعد مسیت خاں اور رضا خاں نے بھی ستار میں اچھی خاصی تبدیلی کی۔ ستار ہی کی طرح امیر خسرو نے طبلہ کو بھی قوالی گائیکی کے لئے قابل استعمال بنایا۔ انہوں نے قدیم ساز پکھاوج کو دو حصوں میں منقسم کر کے طبلہ بنایا۔ پکھاوج کو سنسکرت میں مردنگ کہا جاتا تھا۔ یہ ساز مہابھارت عہد کا مشہور ساز تھا۔ طبلہ عربی کے طبل سے مختص ہے۔ مگر قدیم یہودی ماخذ دیکھا جائے تو طوبال کو طبل کا موجد مانا جاتا ہے۔ ڈھولک میں بھی امیر خسرو نے جدت پیدا کر کے اسے عوام کے لئے بے حد آسان بنا دیا۔ یہ ساز فارسی کے لفظ دہل سے نکلا ہے۔ خسرو کو اس کا آئڈیا بھی پکھاوج سے حاصل ہوا۔ انہوں نے پکھاوج کو چھوٹا کر کے ڈھولک بنایا۔ اسے خالص خسرو کی ایجاد کہا جاتا ہے۔

خسرو کی موسیقی پر سب سے پہلا کام سیف خاں فقیر اللہ نے کیا۔ سیف خاں فقیر اللہ کی کتاب راگ درپن خسرو کی موسیقی دانی پر اہم مواد پیش کرتی ہے۔ انہوں نے راگ درپن میں خسرو کے راگوں اور سازوں کی ایجاد پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ راگ درپن 1665 میں شائع ہوئی تھی۔ راگ درپن گوالیار کے راجا مان سنگھ تومر کی مشہور کتاب مان کوتوہل کا آزاد فارسی ترجمہ ہے، جو امیر خسرو کے موسیقی کے متعلق تفصیل سے معلومات فراہم کرتے ہیں۔

☆☆☆

منظومات شبلی: ایک مطالعہ

قمر الزماں صدیقی

(اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کے۔آر۔جی۔پی۔جی۔کالج، گوالیار، مدھیہ پردیش، موبائل نمبر:8787072529)

اسلامی تاریخ میں شبلی نامی دو شخصیات نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔ایک ابوبکر شبلی جو کہ حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید و خلیفہ تھے، جن کے متعلق حضرت جنید بغدادی کا مشہور قول ہے کہ "لکل قوم تاج و تاج ھٰذا القوم الشبلی "یعنی ہر قوم کا ایک تاج ہوتا ہے اور صوفیاء کا تاج شیخ شبلی ہیں۔دوسرے علامہ شبلی نعمانی جنہیں سرسید کے صفِ اوّل کے رفقاء اور دست و باز و میں شمار کیا جاتا ہے۔پہلے شبلی کو، جنید بغدادی کی فیض صحبت نے ممتاز صوفیاء کی صف میں کھڑا کر دیا تو دوسرے شبلی کو سرسید اور علی گڑھ کی فضاؤں نے مورخ، سوانح نگار، نقاد، خطیب، شاعر و ادیب، شمس العلماء اور علامہ کے درجے تک پہنچایا۔ایک شبلی اگر اہالیانِ اسلام کی عظمت رفتہ ہے تو دوسرا، اُسی عظمت رفتہ کا پارکھ اور سراغ رساں۔

علامہ شبلی نعمانی یکم جون ۱۸۵۷ء کو اعظم گڑھ کے "بندول" نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔نسلاً راجپوت تھے۔والد شیخ حبیب اللہ معزز زمین دار تھے۔نیل کی کھیتی اور وکالت اُن کے پیشے تھے۔ساتھ ہی فارسی شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے، جس کا واضح اثر اُن کی بڑی اولاد شبلی نعمانی پر نظر آیا۔شبلی کے اساتذہ میں مولانا فاروق چریا کوٹی کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔تحصیل علم اور پھر فکر معاش نے شبلی کو ہندوستان کے متعدد خطوں کی سیر کرائی اور بالآخر اس سفر کا اختتام علی گڑھ پہنچ کر ہوا۔جنوری ۱۸۸۳ء میں شبلی کا تقرر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر عربی کے عہدے پر ہوا۔تقریباً سولہ برس علی گڑھ میں اپنی خدمات انجام دیں۔اس کے بعد نظام حیدرآباد کے دربار، ندوۃ العلماء اور آخری دور میں اپنے قائم کردہ ادارے دارالمصنفین سے وابستہ رہے۔۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو اعظم گڑھ میں وفات پائی۔

مولانا شبلی ایک حد تک مذہبی مزاج کے حامل تھے لیکن اس کے ساتھ ہی مذہبی رواداری اور تعصب سے گریز بھی آپ کی شخصیت کا حصہ تھے۔شبلی کے مضمون "مسلمانوں کی پالیٹیکل کروٹ" کی چوتھی قسط اس موضوع کا بخوبی احاطہ کرتی ہے۔اُن کی نظموں میں جہاں ایک طرف عدلِ جہاں گیری کا بیان ملتا ہے وہیں دوسری سمت ہندو مہاراجگان کی تعریف میں اشعار بھی ملتے ہیں۔مولانا شبلی کے بے تکلف دوست عبدالرزاق کانپوری کے بقول شبلی نے کانپور کی رام لیلا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی، جو اُن کی مذہبی رواداری کے جذبات کی عکاس ہے۔اُن کے حلقۂ احباب کی وسعت مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد علی مونگیری سے لے کر داغؔ دہلوی، اکبرؔ الہ آبادی اور عطیہ فیضی کے ناموں کا احاطہ کرتی ہے۔شبلی کی شخصیت اعلیٰ انسانی اخلاق و اقدار کی حامل تھی۔خودداری کا یہ عالم تھا کہ ندوۃ العلماء کے لئے پہلے پہل جب چندہ کرنے کی نوبت آئی تو یہ شعر پڑھا:

عاشقِ تازہ ہوں اور وصل کی اوّل شب ہے
شرم سے کہہ نہیں سکتا ہوں کہ کیا مطلب ہے؟

مولانا شبلی ایک ہمہ جہت اور پر کشش شخصیت کے مالک تھے۔انشاء پرداز، متکلم معقولی، مورخ وسوانح نگار، شاہان اسلام کے مدح خوان وسیرۃ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور شعر وسخن کے اسرار و رموز کے شناسا بھی تھے۔ابتدائی تخلص تسنیم تھا بعد میں از خود شبلی تخلص اختیار کیا۔اردو اور فارسی کی تمامی مروجہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن نظم جدید جو کہ عہد شبلی کا امتیازی کارنامہ ہے، اس فن میں شبلی نعمانی نے اپنے علمی وفکری میلانات کا نہایت حسن وخوبی کے ساتھ اظہار کیا ہے۔

شبلی پہلے شخص ہیں جس نے اردو مثنوی کو قصّوں کی طلسماتی دنیا سے نکال کر باقاعدہ قومی مقصد کے لیے استعمال کیا، اور مثنوی کے آفاقی امکانات کو عملی طور پر واضح کیا۔قومی عروج و زوال اور سرسید کی مساعیات کو موضوع بنا کر کہی گئی نظم "صبحِ امید" میں مثنوی "گلزار نسیم" کی بحر استعمال کی گئی ہے۔لفظِ فصیح، معنی بلند، ترکیبیں دلپذیر، تشبیہ و استعارے کی نازکی، حشو زائد سے پاک اور پُر اثر بیان جیسی صفات کے سبب مثنوی "صبح امید" کو کلیم الدین احمد نے مسدس حالی پر فوقیت دی۔اسی مثنوی میں سرسید کی قلمی تصویر کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

صورت سے عیاں جلالِ شاہی
چہرے پر فروغِ صبح گاہی
وہ ریشِ دراز کی سفیدی
چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی

شبلی کا عہد انتشارات کا عہد تھا۔ ۱۸۵۷ء کی غدر کے زخم ہندوستانیوں کے ذہن ودل میں رہ رہ کر رِس رہے تھے۔ سیاسی، سماجی ہر اک سطحِ زندگی انگریزوں کی ناانصافیوں سے عبارت تھی۔ایسے تاریک دور میں شبلی عدلِ فاروقی و جہانگیری کی روشنی اپنی نظموں کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔قیامِ انسانیت کے سلسلے میں شبلی اسلامی تاریخ کے اُن ادوار سے مثالیں پیش کرتے ہیں جب رعایا "نشۂ عدل و مساوات میں مخمور" ہوا کرتی تھی۔شبلی کی فکر کا مرکز وہ زمانہ ہے جب ایک بڑھیا عمر فاروق جیسے حاکم وقت کو بے تکلفانہ برسرِ دربار تنبیہ کر دیتی ہے اور خلیفۂ وقت اُس کی بات پر گردن خم کر دیتا ہے، ملکہ نور جہاں ایک راہ گیر کو اس کی گستاخ نگاہی کے صلے میں بندوق سے ڈھیر کر دیتی ہے تو شہنشاہ ہند جہانگیر تمامی تکلفات کو درگزر کرتے ہوئے اس مقدمے پر قاضی سے حکمِ شریعت دریافت کرتا ہے۔یہاں قاضی کا بے خوف حکم شرع بیان کرنا اور اس کے بعد حاکمِ وقت کے تاثر کو شبلی یوں نظم کرتے ہیں:

مفتی دیں نے بے خوف وخطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن
لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن

سرسید نے معاشرے میں پھیلے ہوئے جن اخلاقی اور نفسیاتی امراض کی نشان دہی کی ہے اور تمام عمر اُن سے برسر پیکار رہے، اُن میں "تعصب و تنگ نظری" کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔شبلی سرسید کے اسی فکر کو اپنی منظومات کا پیکر عطا کرتے ہیں۔نظم "مساواتِ اسلام" کے اشعار بتاتے ہیں کہ دور جاہلیت کا عرب کس طرح نسلی و ذاتی عصبیت کا شکار تھا کہ میدان کارزار میں اپنے حریف کے لیے بھی "کفو" تلاش کرتا تھا۔بعد اسلام وہی عرب معاشرہ اس قدر روشن خیال ہو جاتا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر، بلال حبشی کی وفات پر اپنی تعزیت ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

اٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا آقا
اٹھ گیا آج نقیبِ حشمِ پیغمبر

شبلی پیغمبر اسلام اور آپ ﷺ کے جانثاروں کے اسوۂ حسنہ سے نایاب گوشے تلاش کر کے، انہیں اپنی نظم کا موضوع بناتے ہیں جس کی مثال کم از کم اردو شاعری میں اس سے قبل مفقود نظر آتی ہے۔کہیں وہ محسنِ انسانیت ﷺ کی غرباء پروری کے اُس عالم کا ذکر کرتے ہیں جہاں وہ اصحاب صفہ کی پرورش کو اپنی عزیز بیٹی فاطمہ زہرا کی حلِ مشکلات پر فوقیت دیتے ہیں۔تو دوسری سمت پیغمبر اسلام کے جانثاروں کی حوصلہ مندی اور ایثار کے جذبے کو بیان کرتے ہوئے شبلی ایک

انصاری صحابیہ کا واقعہ نظم کرتے ہیں جس کے سبھی اعزا غزوۂ احد میں شہید ہو جاتے ہیں لیکن ایسے عالم میں بھی اُس مصیبت زدہ خاتون کی فکر کے مرکز کون تھا؟ شبلی لکھتے ہیں:

اُس عفیفہ نے یہ سب سُن کے کہا تو یہ کہا
یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہ اُمم
سب نے دی اُسکو بشارت کہ سلامت ہیں حضور
گرچہ زخمی ہیں سر و سینہ و پہلو شکم
بڑھ کے اُس نے رُخ اقدس کو جو دیکھا تو کہا
تو سلامت ہے تو پھر ہیچ ہیں سب رنج والم

محاکات و مرقع کشی شبلی کے امتیازی اوصاف ہیں جس سے انہیں فطری مناسبت ہے، نثر ہو یا نظم خیال، واقعے، تجربے یا مناظر فطرت کا ایسا عکس کھینچتے ہیں کہ آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ یہی صفات ہیں جن کے سبب کہا گیا کہ "شبلی پہلے یونانی ہیں جو ہندوستانیوں میں پیدا ہوئے، وہ اگر انشاء پرداز نہ ہوتے تو مصوّر ہوتے۔" ہجرتِ نبوی کے مشکل ترین سفر اور آمدِ مدینہ کی پرمسرت نظاروں کو شبلی نے جس خوبی سے نظم کیا ہے وہ اردو شاعری اور منظوم سیرۃ نگاری کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

یاں مدینے میں ہوا غل کی حضور آتے ہیں
راہ میں آنکھیں بچھانے لگے ارباب نظر
لڑکیاں گانے لگیں شوق میں آکر اشعار
نغمہ ہائے "طلع البدر" سے گونج اٹھے گھر
ماں کی آغوش میں بچے بھی مچل جانے لگے
ناز نینانِ حرم بھی نکل آئیں باہر
دفعتاً کوکبۂ شاہِ رُسل آ پہنچا
غل ہو صَلّ علی شاہ اناسِ و بشر
طور سے حضرتِ موسیٰ کی صدا آتی تھی
آج اک اور جھلک سی مجھے آئی ہے نظر

اردو دنیا میں شبلی "ادب برائے زندگی" کے مقابل "ادب برائے ادب" کے پہلے موئد ہیں۔ انہوں نے انسانی جذبات یا مناظر فطرت کی موثر انداز میں تصویر کشی کو شاعری قرار دیا ہے۔ قوت محاکات و تخئیل کو بڑے شاعر کی شرائط میں شمار کرتے ہیں۔ انداز بیان کو پر اثر بنانے کے لوازمات میں تشبیہات و استعارات اور دیگر صنائع بدائع کی اہمیت کے بھی قائل ہیں۔ شبلی اپنے منظوم تاریخی واقعات کو انہیں زیورات سے آراستہ کرتے ہیں۔ مثلاً: اہل عرب کی مہمان نوازی مشہور ہے، یہ وہ خوبی ہے جو اُن کے درمیان زمانۂ جاہلیت میں بھی موجود تھی۔ شبلی اسی تاریخی پس منظر کو جذبات کا گداز عطا کرتے ہیں۔ ضیافتِ نبوی کے سلسلے میں اہل مدینہ کی بیقراری اور بے صبری کے جذبات کا، اس سے عمدہ بیان نثر و نظم کی دنیا میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے:

سینے کہتے تھے کہ خلوت گہہِ دل حاضر ہے
آنکھیں کہتی تھیں کہ دو اور بھی تیّار ہیں گھر

اظہار رائے کی آزادی، اس کے حدود و قیود اور معاشرے کے پس ماندہ طبقے کے حقوق کی حفاظت دورِ حاضر کے ایسے مسائل ہیں جو مفکرین کے درمیان موضوعِ نزاع بنا ہوئے ہیں۔ شبلی نے اِن کی اہمیت کو آج سے ۱۰۰/ برس قبل ہی محسوس کر لیا تھا اور اُنہیں اپنی نظم کو موضوع بنایا ہے۔ قبولِ اسلام کے وقت ہند، زوجۂ ابوسفیان کے اس سوال کو کہ "اے رسول میرے بیٹوں کو تو آپ نے ہی قتل کیا ہے پھر بھلا مجھے اولاد کے قتل نہ کرنے کی تلقین کیوں کر رہے ہیں" کو نہایت خندہ پیشانی سے سماعت فرمانے کو شبلی آزادیِ افکار اور اظہار رائے کی آزادی کے احترام سے تعبیر کرتے ہوئے اپنی نظم کا حصہ بناتے ہیں۔ نیز تعمیر مسجد نبوی کے سلسلے میں رسول کریم ﷺ کی مساعیات جلیلہ اور قطعہ زمین کی خریداری کے سلسلے میں "یتیموں کے والی اور غلاموں کے مولیٰ" کی روشن تصویر پیش کرتے ہیں:

بارہ ہزار سکۂ رائج عطا کیے
یہ تھا وہ خلق جس سے مخالف بھی رام تھا

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ۱۸۸۸ء میں عمل میں آیا۔ یہ شبلی کے عہد شباب کا زمانہ تھا۔ شبلی اس سیاسی پارٹی کے پرزور داعی اور ایک حد تک وکیل بھی تھے۔ جس کا بیّن ثبوت آپ کے تربیت یافتہ مولانا ابو الکلام آزاد ہیں۔ اس کے برعکس شبلی مسلم لیگ کے شدید مخالفین میں سے تھے جس کا اظہار "مسلم لیگ، منکر مے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن، سوٹ ایبل سیلف گورنمنٹ" جیسی نظموں میں کبھی واضح اور کبھی پوشیدہ طور پر نظر آتا ہے۔

مذکورہ نظموں میں اکبر الہ آبادی کا شوخ طنزیہ رنگ خاص طور پر متوجہ کرتا ہے۔شبلی اپنی منظومات "احرارِ قوم اور طفلِ سیاست، مسئلہ الحاق" میں سیاستِ ہندوستان کے مباحث کو غوغائے طفلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ کانگریس سے اپنی انسیت کے سبب ملنے والے طعنوں اور مسلم لیگ کے دبی زبان میں "سوارا ج" کے کانگریسی تصور پر شبلی طنزیہ انداز میں کہتے ہیں:

کانگریس سے مجھ کو اظہار براءت کیوں نہیں
کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن
اب تو مسلم لیگ کو بھی خواب آتے ہیں نظر
اب تو ہے کچھ اور طرزِ نغمۂ مرغِ چمن

مدرسہ علی گڑھ کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے میں سرسید نے ہر ممکن تدبیر کو اختیار کیا۔انتہا یہ رہی کہ جب انہوں نے عوامی چندہ کی غرض سے ایک کھیل ترتیب دیا۔جس میں سرسید نے مدرسہ علی گڑھ کے نامی اساتذہ،طلباء اور از خود اسٹیج پر آکر تماشے کا حصہ بننا منظور کیا۔شبلی بھی عملی طور پر اس ڈرامے کا حصہ بنے۔نظم "تماشائے عبرت" میں شبلی نے سرسید کی اِسی ڈرامہ کمپنی اور قوم کی بے حسی کا پر درد مرثیہ کہا ہے۔مسدس کی ہئیت میں کہی گئی اِس نظم کے بعض اشعار اقبال کے "شکوہ" کا پیش خیمہ قرار دیے جاسکتے ہیں:

کس کی آمد میں فدا کر دیا جیپال نے راج
کس کو کسریٰ نے دیا تخت وزر وافسر وتاج
کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج
تجھ پہ اے قوم اثر کرتا ہے افسوں جن کا
یہ وہی تھے کہ رگوں میں ہے ترے خوں جن کا

علی گڑھ تحریک اور سرسید سے اس قدر قلبی وابستگی کے باوجود شبلی کو اگر اِس تحریک اور اِس کے نظریہ میں کچھ خامی نظر آئی تو اُس کا برملا اظہار بھی کیا۔سرسید تحریک بلا شبہ ایک اصلاحی تحریک تھی۔جس کے زیر اثر ایسی ادبی روایت کو فروغ حاصل ہوا جو سادگی،اصلیت اور جوش کے چکر میں شاعری کی کلاسیکی جمالیات کو یکسر نظر انداز کرتی جارہی تھی۔شبلی شعر و ادب میں کوری اصلاح کے قائل نہ تھے،اُن کا ماننا تھا کہ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہیے بعد میں کچھ اور۔یہی وہ نظریہ ہے جو آگے چل جدید تعین قدر کا مرکزی خیال ثابت ہوا۔نظم "مد و جزر" کے طنزیہ نشتر نہایت خوبی سے بتاتے ہیں کہ شبلی کا روئے سخن کس کی طرف ہے:

شاعروں نے جو نئی آج بچھائی ہے بساط
اس میں اِن پر بھی کہیں سے کوئی زد ہے کہ نہیں؟
فیصلہ کرنے سے پہلے میں ذرا دیکھ تو لوں
"جزر" جیسا تھا اسی زور کا "مد" ہے کہ نہیں

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ منظوماتِ شبلی احترامِ انسانیت،انصاف پسندی،آزادی افکار،تحفظ حقوق جیسے اعلیٰ انسانی اقدار کا احاطہ کرتی ہیں،نیز اردو نظم کی روایت جو اُس عہد تک عوام پسندی،لفظی جوڑ توڑ اور کسی ایک انجمن یا ادارے کے پہلے سے طے شدہ افکار کی پابند تھی،سے آزادی دلاتی ہیں۔انجمنِ پنجاب کے موضوعی مشاعروں کے تحت لکھی گئیں سادہ اور پھیکی منظومات سے الگ ہو کر موضوع وافکار کے تحت شعر گوئی کی ایک نئی شاہ راہ قائم کرتی ہیں۔اسی شاہ راہ پر آگے چل کر اقبال،چکبست،اختر شیرانی اور پھر فیض نے اردو نظم کو اُس کی منزل مقصود تک پہنچایا۔شبلی صالح اقدار کے قیام کے لیے فرضی قصوں کے بجائے حقیقی زندگی اور تاریخ سے اپنا مواد کشید کرتے ہیں،جن میں ایک صحت مند انسانی زندگی سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔اپنے سیاسی اور سماجی افکار و نظریات کا اظہار شبلی کے یہاں دوسرے ہم عصروں کے مقابل نہایت واضح طور پر نظر آتا ہے۔اُن کے یہاں اُس باغیانہ تیور کے نقوش بھی نظر آتے ہیں جو آگے چل کر فیض اور حبیب جالب جیسے شعراء کے یہاں عہدِ شباب کو پہنچے۔شبلی کی شاعری میں موجود اِنہیں خوبیوں کو اُن کے ہم عصر ادیب اور تھوڑے بہت شاعر ڈپٹی نذیر احمد نے بھی محسوس کرلیا تھا جس کے نتیجے میں اپنی ہی شاعری سے گریز کو اِن لفظوں میں بیان کیا:

تم اپنی نثر کو لو،نظم کو چھوڑو نذیر احمد
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

☆☆☆

منور رانا: غزل میں ماں کی نغمہ سرائی کرنے والا شاعر

ایس معشوق احمد

(کلگام، جموں وکشمیر-192231، Mob. 8493981240)

اردو شاعری میں جو استجابت اور مرغوبیت صنف غزل نے پائی وہ کسی اور صنف کو نصیب نہ ہوئی۔ غزل میں ہر دور میں شعراء نے مختلف موضوعات کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ میر ہو یا غالب، اقبال ہو یا حسرت، جگر ہو یا فراز ہر شاعر نے عمدہ غزلوں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات، تجربات، احساسات اور جذبات کو اس میں داخل کیا ہے۔ غزل صرف عورتوں سے باتیں کرنا یا محبوب کا تذکرہ کرنے تک محدود نہ رہی بلکہ اس میں تاریخ، فلسفہ، مذہب، روزمرہ کے مسائل غرض من کی دنیا سے لے کر سنسار کے معاملات تک کو جمال وکمال سے پیش کیا گیا۔ اردو شاعری میں تو ماں کا تذکرہ بہت سارے شعراء نے کیا ہے۔ کسی نے مثنوی میں اپنے ماں کو خراج تحسین پیش کیا تو کسی نے نظم میں اس ہستی کی عظمت کے گن گائے۔ کلاسکی شعراء ہوں یا ادبی دنیا کے نئے منظر نامے پر ابھرنے والے شعراء کم وبیش ہر شاعر نے ماں کی عظمت، الفت، محبت اور تقدس کا اظہار اپنی شاعری میں کیا ہے لیکن اردو غزل میں کم ہی شعراء ایسے ہیں جنہوں نے ماں کے مقدس وجود کی مختلف جہات کو غزل میں برتا ہے۔ منور رانا ان شعراء میں ہیں جنہوں نے اردو غزل میں کثرت سے ماں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے یہاں غزلوں میں دیگر موضوعات کے علاوہ کثیر تعداد میں ایسے اشعار ہیں جن میں ماں جیسی متبرک ہستی کو موضوع بنا کر ان کیفیات وجذبات کا اظہار ملتا ہے جو ایک ماں کے دل میں اپنے بچوں کے تئیں موجزن ہوتے ہیں۔ اول اول میں تو ان کی اس جدت پر اعتراضات کئے گئے لیکن اعتراضات سے قطع نظر جن خوبیوں کے ساتھ انہوں نے ماں کی کیفیات، دعاؤں، عظمت، تقدس، بڑائی کا ذکر کیا اس کو بعد میں خوب سراہا گیا ہے۔

منور رانا کے شعری مجموعے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں چھپ کر منظر عام پر آئے ہیں۔ ان کے ہندی شعری مجموعوں میں غزل گاؤں (1981ء)، پیپل چھاؤں (1984ء)، مور پاؤں (1987ء)، سب اس کے لیے (1989ء)، نیم کے پھول (1991ء)، بدن سرائی (1996ء)، پھر کبیر (2007ء)، شادابہ (2012ء) اور سخن سرائی (2012ء) چھپ کر لوگوں میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے اردو کے شعری مجموعوں میں کہو ظل الٰہی سے (2000ء)، جنگلی پھول (2008ء) اور منور رانا کی سو غزلیں (2008ء) چھپ چکے ہیں۔ جو شعری مجموعے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں چھپ چکے ہیں ان میں گھر اکیلا ہو گیا (2008ء)، ماں (2005ء)، نئے موسم کے پھول (2009ء) اور مہاجر نامہ (2010ء) شامل ہیں۔ شاعری کے علاوہ ان کی نثر میں بھی جان اور نیا پن ہے۔ ان کی شاعری کے دیوانے ان کی نثری کتابوں کو بھی سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ انہوں نے خوبصورت نثر، دلکش اسلوب اور حسین انداز میں جو بزرگوں کے مرقعے کھینچے وہ لاجواب ہیں۔ ان کی نثری تصانیف میں بغیر نقشے

کا مکان (2000ء)، سفید جنگلی کبوتر (2005ء)، چہرے یاد رہتے ہیں (2008ء) اور تین شہروں کا چوتھا آدمی (2010ء) شامل ہیں۔

منور رانا کے مختلف شعری مجموعے جو منظر عام پر آئے ہیں ان میں ماں کے بارے میں اشعار ملتے ہیں لیکن ان کا ایک شعری مجموعہ ماں کے عنوان سے 2005ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب "ہر اس بیٹے کے نام جسے ماں یاد ہے" کے نام انتساب کی گئی ہے۔ اس مجموعے کی محور و مرکز ماں ہے اور پورے مجموعے میں ماں، بہن، بھائی کے رشتوں کو شاعری میں پرویا گیا ہے۔ شعراء جس دور میں غزل میں محبوب کی جدائی، وصال، بے وفائی، دنیائی مسائل اور سیاست کا ذکر کر رہے تھے اور سائنسی ایجادات سے لے کر معاشرے کے بدلتے ہوئے رویوں تک نئے نئے موضوعات کو غزل میں بیان کر رہے تھے، وہیں منور رانا ماں کی عظمت، دعاؤں کا اثر، بیٹے کے تئیں شفقت، بچوں کی نگہداشت کرنے والی شخصیت کا بیان عمدہ پیرائے میں کر رہے تھے۔

انسانی رشتوں میں سب سے مقدس، پاکیزہ اور مضبوط رشتہ ماں کا ہے۔ ماں زمین پر رحمت خداوندی کا نمائندہ خاص ہے۔ ماں اپنے بچے کے لیے کیا نہیں کرتی خود تکالیف اٹھاتی ہے، دایہ بن کر بچے کی پرورش کرتی ہے، باورچن اور خادمہ کا روپ دھارن کر لیتی ہے تا کہ اپنے بچوں کا خیال اور نگہداشت کر سکے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر بچے کی خوراک کا انتظام کرتی ہے۔ یوں ہی ماں کے پیروں تلے جنت نہیں ہے۔ اللہ نے قرآن میں تاکید کی ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ ماں کا حق بہت زیادہ ہے۔ اللہ نے ان تکالیف کا بھی تذکرہ کیا ہے جو ماں اپنے بچے کے سلسلے میں برداشت کرتی ہے۔ ولادت کے وقت جان کنی کی مانند تکالیف سے دوچار ہوتی ہے، پیدائش کے بعد اسے دودھ پلاتی ہے، اس کی تربیت کرتی ہے، اس کے آرام کی خاطر اپنا آرام قربان کرتی ہے، اسی لیے ماں کا حق باپ سے زیادہ ہے۔ اس دنیا میں سب سے بڑی نعمت ماں اور اس کی دعائیں ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انطاکیہ سے شام جا رہے تھے۔ چلتے چلتے تھک گئے تو اللہ نے وحی فرمائی میرے کلیم اس پہاڑی وادی میں میرا ایک خاص بندہ ہے اس سے سواری طلب کر۔ آپ نے ایک بندے کو نماز پڑھتے دیکھا جب وہ فارغ ہوئے تو آپ نے کہا: اے خدا کے بندے مجھے سواری چاہیے۔ اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی تو بادل کا ٹکڑا آتا دکھائی دیا۔ اس نے کہا نیچے آ اور اس انسان کو یہ جہاں جانا چاہتا ہے پہنچا دے۔ حضرت موسیٰ سوار ہوئے اور چل دیے۔ اللہ نے فرمایا اے میرے کلیم تمہیں معلوم ہے کہ اس کو یہ مرتبہ کیسے حاصل ہوا۔ میں نے اسے یہ مرتبہ اپنی ماں کی خدمت کے صلے میں دیا ہے۔ اس کی ماں نے بوقت اجل دعا مانگی تھی کہ الٰہی اس نے میری ضرورت کا خیال رکھا تیرے حضور میری دعا ہے کہ تجھ سے یہ جو بھی طلب کرے عطا فرمانا۔ اے موسیٰ اگر یہ مجھ سے آسمان کو زمین پر الٹ دینے کی بھی درخواست کرے گا تو میں وہ بھی منظور کر لوں گا۔ منور رانا ماں کی عظمت، مرتبے اور اسلامی تعلیمات سے واقف نظر آتے ہیں۔ ماں کی عظمت کا بیان جو اسلامی تعلیمات میں در آیا ہے اس بنیاد پر ماں سے محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ منور رانا نے ماں کی محبت، عقیدت، مرتبے، حرمت کی زرخیز زمین پر اپنی شاعری کا محل کھڑا کیا ہے۔

انسان میں کمیاں اور خامیاں ہو سکتی ہیں۔ چونکہ شاعر بھی انسان ہے خلاف قیاس نہیں کہ اس کے کلام میں بھی کمیاں اور خامیاں ہوں۔ کسی شاعر کے یہاں یہ دعویٰ نہیں ملتا کہ اس کا کلام حرف آخر ہے اور تمام فنی خامیوں اور کوتاہیوں سے پاک ہے۔ ناقدین اور معترضین کسی بھی شاعر کے کلام پر اعتراضات اٹھاتے ہیں۔ بعض اعتراضات حق بجانب ہوتے ہیں اور بعض مجذوب کی بڑ ثابت ہوتے ہیں۔ منور رانا جب غزل میں ماں کی پرستش اور اس کی عظمتوں اور محبتوں کو بیان کر رہے

تھے تو ان پر بھی تنقید ہوئی اور یہ کہہ کر تنقید کا نشانہ بنائے گئے کہ غزل کے معنی محبوب سے باتیں کرنا ہیں، جس کے جواب میں وہ اپنے شعری مجموعے ماں میں "اپنی بات" کے عنوان سے ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ:

"ہر خاص و عام لغت کے مطابق غزل کا مطلب محبوب سے باتیں کرنا ہے۔ اگر اسے سچ مان لیا جائے تو محبوب "ماں" کیوں نہیں ہوسکتی! کیا دنیا کے سب سے مضبوط، سدا بہار اور پاکیزہ رشتے کو غزل بنانا گناہ ہے، کیا تقدس کے "پھول بستر" پر غزل کو سلانا جرم ہے۔ میری شاعری پر اکثر زیادہ پڑھے لکھے لوگ جذباتی استحصال کا الزام لگاتے رہے ہیں۔ اگر اسے درست مان لیا جائے تو پھر محبوب کے حسن و شباب، اس کے تن و توش، اس کے لب و رخسار، اس کے رخ و گیسو، اس کے سینے اور کمر کی پیمائش کو عیاشی کیوں نہیں کہا جاتا ہے۔

اگر میرے شعر emotional blackmailing ہیں تو پھر،

"جنت ماں کے پیروں کے نیچے ہے"

"موسیٰ اب تو تیری وہ ماں بھی رہی جس کی دعائیں تجھے بچا لیا کرتی تھیں"

"اگر مرد کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو ماں کے قدموں پر ہوتی"

"میدان حشر میں تمہیں تمہاری ماں کی نسبت سے پکارا جائے گا"

جیسے جملے کیا بے معنی ہیں۔!

میں پوری ایمانداری سے اس بات کا تحریری اقرار کرتا ہوں کہ میں دنیا کی سب سے مقدس اور عظیم رشتے کا پرچار صرف اس لئے کرتا ہوں کہ اگر میرے شعر پڑھ کر کوئی بھی بیٹا اپنی ماں کا خیال کرنے لگے، رشتوں کی نزاکت کا احترام کرنے لگے تو شاید اس کے اجر میں میرے کچھ گناہوں کا بوجھ ہلکا ہوجائے"۔

(مجموعہ، ماں "اپنی بات" از منور رانا)۔

غزل کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اس میں ہر موضوع کو سمایا جا سکتا ہے، بس شرط ہے سلیقہ اور طریقہ، جس سے منور رانا واقف ہیں۔ اب محبوب کے لب و رخسار، گیسو و عارض، کمر، قد، ہجر و وصال، جدائی اور ملن کی روداد ہی غزل میں بیان نہیں ہوتی بلکہ اب تو غزل کے موضوعات میں ساری کائنات کے علاوہ ہماری، تمہاری بات بھی شامل ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ منور رانا نے دیگر موضوعات جن پر ان کے معاصرین دادِ سخن دے رہے تھے کو اپنی غزلوں میں نہیں برتا۔ غزل کے موضوعات کو وسعت دینے اور نئے نئے مضامین کو اچھے ڈھنگ سے برتنے میں منور رانا کا جواب نہیں۔ جہاں انہوں نے سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی مسائل کی عکاسی کی، وہیں ایک خاص اضافہ موضوع کے اعتبار سے یہ کیا کہ ماں کے حوالے سے مختلف موضوعات جو بن سکتے تھے ان کو صفحہ قرطاس پر اتارا۔ ان کے چند اشعار دیکھیں جن میں دیگر موضوعات کو برتا گیا ہے:

چمن میں گھومنے پھرنے کے کچھ آداب ہوتے ہیں
ادھر ہرگز نہیں جانا ادھر صیاد رہتا ہے

صرف تاریخ بتانے کے لیے زندہ ہوں
اب مرا گھر میں بھی ہونا ہے کلنڈر ہونا

آپ کو چہرے سے بھی بیمار ہونا چاہئے
عشق ہے تو عشق کا اظہار ہونا چاہئے

ایرے غیرے لوگ بھی پڑھنے لگے ہیں ان دنوں
آپ کو عورت نہیں اخبار ہونا چاہئے

اب بڑے لوگوں سے اچھائی کی امید نہ کر
کیسے ممکن ہے کریلا کوئی میٹھا کر لے

خود اپنے ہی ہاتھوں کا لکھا کاٹ رہا ہوں
لے دیکھ لے دنیا میں پتا کاٹ رہا ہوں

خون رلوائے گی یہ جنگل پرستی ایک دن
سب چلے جائیں گے خالی کر کے بستی ایک دن

اللہ کی طرف سے خاص اور نرالا تحفہ ماں ہے۔ جس کی کوکھ سے عظیم، معتبر، بزرگ، نجیب اور افضل ترین انسانوں نے جنم لیا۔ اللہ کو جب اپنی رحمتوں، شفقتوں، عظمتوں اور رفعتوں کا جلوہ دکھانا مقصود ہوا تو انہوں نے ماں جیسی ہستی کا چناؤ کیا جو نہایت مہربان، شفیق اور محبت کی انتہائی پاکیزہ مثال کا مجسمہ

ہے۔اس کی آغوش درسگاہ ہے اور خوشنودی باعث نجات۔ دنیا کی کسی دوا میں وہ تاثیر نہیں جو اس کی دعا میں ہے۔ ہر دکھ کا مداوا، ہر پریشانی کا حل، ہر مصیبت کی نجات اور ہر کرب سے چھٹکارا اگر کوئی چیز دلا سکتی ہے تو وہ ماں کی دعا ہے۔ ہر مذہب میں اس کا احترام اور عظمت مسلم ہے۔اس کی عزت وشرف ،حرمت اور توقیر سے کسی کو انکار نہیں کہ یہ سراپا اخلاص اور محبت کا پیکر ہے۔ ماں ہی ہے جو اپنی اولاد کے لیے سو تکلیفیں اٹھاتی ہے۔خود اذیت برداشت کرتی ہے لیکن اپنی اولاد کو ایذا میں نہیں دیکھ سکتی۔ اولاد کے لیے منتیں کرتی ہے،خدا کے حضور رو رو کر دعا کرتی ہے اور حتی الامکان کوشش کرتی ہے کہ اپنی اولاد کو غموں ،مصیبتوں، پریشانیوں اور دھوپ چھاؤں سے محفوظ رکھ سکے۔اس کی دعا میں اثر اور تاثیر ہے جو اولاد کی دنیا اور آخرت سنوارنے کی طاقت رکھتی ہے۔ واقعہ ہے کہ اللہ تعالی نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے فرمایا کہ سمندر کی طرف جائیں۔آپ نے اپنے وزیر حضرت آصف کو ساتھ لیا اور سمندر کے قریب پہنچے، پر کچھ نظر نہ آیا۔حضرت سلیمان علیہ السلام نے آصف کو حکم دیا کہ سمندر میں غوطہ لگائیں۔انہوں نے حکم کی تعمیل کی تو انہیں سمندر میں عجیب وغریب گنبد نظر آیا۔اس عمارت میں چار دروازے موتی، یاقوت، جواہر اور زبرجد کے بنے ہوئے پائے اور سبھی کھلے پڑے ہیں لیکن قطرہ بھر پانی بھی اندر نہیں جاتا۔اس عمارت کے اندر ایک حسین وجمیل نوجوان عبادت میں مصروف پایا۔حضرت سلیمان علیہ السلام اس کے پاس گئے اور حال معلوم کیا۔نوجوان نے بیان کیا کہ حضور میرا باپ اپاہج اور والدہ اندھی تھی۔میں نے سات سال تک ان کی خوب خدمت کی۔میری والدہ نے انتقال سے قبل میرے لیے دعا کی کہ الٰہی اس کو اپنی عبادت کے لیے طویل عمر عطا کر اور ایسی جگہ عطا کر جو نہ زمین میں ہو نہ آسمان میں۔ یہ سب ماں کی دعا کی برکت ہے۔

ہر بچے کو اپنی ماں سے لگاؤ ہوتا ہے اور ماں کا اپنے بچے سے انس ومحبت رکھنا فطری ہے۔ماں اپنے بچے پر جی جان وارتی ہے ،اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی ہے۔جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس وقت سے ہی اپنی دعاؤں کے سائے اس پر کئے رکھتی ہے۔بچہ اٹھ کھڑا ہو جائے تو دعا اور بیٹھ جائے تو دعا،سفر پر جانا ہو یا کسی کام کی شروعات کرنی ہو ماں کی زبان دعائیں دیتے نہیں تھکتی۔

چونکہ ماں اپنے بچہ پر شفیق اور مہربان ہوتی ہے ، وہ اپنی اولاد کے لیے دل سے دعائیں کرتی ہے اور دل سے کی ہوئی دعائیں بارگاہ الٰہی میں جلدی قبول ہو جاتی ہیں۔ماں کی دعا سے ہر مصیبت اور مشکل ٹل جاتی ہے۔اولاد کی قسمت سنور جاتی ہے۔ماں کی دعا اپنے بچے کے لیے برکتوں اور رحمتوں کے نزول کا سبب بنتی ہے۔منور رانا نے اپنی غزلوں میں ان دعاؤں کو موضوع بنایا جو ماں اپنی اولاد کے لیے مختلف وقتوں میں کرتی ہے۔ماں کی دعائیں مصیبتوں ، حادثوں، بلاؤں اور تکلیفوں کے سامنے ڈٹ کر انہیں پسپا کرتی ہیں۔یہ دعاؤں کا حصار ہر بلا اور مصیبت سے حفاظت کرتا ہے:

بھیجے گئے فرشتے ہمارے بچاؤ میں
جب حادثات ماں کی دعا میں الجھ پڑے

جب کشتی میری سیلاب میں آجاتی ہے
ماں دعا کرتے ہوئے خواب میں آجاتی ہے

گھیر لینے کو مجھے جب بھی بلائیں آگئیں
ڈھال بن کر سامنے ماں کی دعائیں آگئیں

حادثوں کی گرد سے خود کو بچانے کے لیے
ماں ہم اپنے ساتھ بس تیری دعا لے جائیں گے

ابھی زندہ ہے ماں میری مجھے کچھ نہیں ہوگا
میں گھر سے جب نکلتا ہوں دعا بھی ساتھ چلتی ہے

ماں بچوں کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتی ہے۔ماں کی حقیقی خوشی اپنے لخت جگر کو خوش اور پر مسرت دیکھ کر ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچے سے ناراض نہیں ہوتی ، نا ہی اس کے لیے بددعا کرتی ہے۔وہ اپنے سارے غم

اپنے بچے کو دیکھ کر بھول جاتی ہے۔منور رانا نے ان تمام کیفیات کو اپنے اشعار میں پرویا ہے جن کو ماں محسوس کرتی ہے۔جب اس کا بیٹا اس کے سامنے اور خوش وشاد ماں ہو۔اس کی تھکن مسرت میں بدل جاتی ہے جب ماں اپنی اولاد کو دیکھتی ہے:

دن بھر کی مشقت سے بدن چور ہے لیکن
ماں نے مجھے دیکھا تو تھکن بھول گئی ہے

مقدس مسکراہٹ ماں کے ہونٹوں پر لرزتی ہے
کسی بچے کا جب پہلا سپارا ختم ہوتا ہے

لبوں پہ اس کے کبھی بد دعا نہیں ہوتی
بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

ماں سے گھر کی رونق ہوتی ہے۔گھر میں چہل پہل اور حقیقی خوشی اسی سے ہے۔وہ گھر پُر رونق ہوتا ہے جس گھر میں ماں کی ممتا اور وجود ہو۔وہ گھر غموں کے اندھیر سے دور اور خوشیوں کی روشنی سے قریب ہوتا ہے۔ماں کے وجود سے گھر میں اجالا اور تابندگی ہوتی ہے۔اولاد جب تک گھر نہیں لوٹتی ماں اس کے لیے دعا گو رہتی ہے:

اے اندھیرے دیکھ لے منہ تیرا کالا ہو گیا
ماں نے آنکھیں کھول دی گھر میں اجالا ہو گیا

یہ ایسا قرض ہے جو میں ادا کر ہی نہیں سکتا
میں جب تک گھر نہ لوٹوں ماں سجدے میں رہتی ہے

ماں کی دعائیں ڈھال بن کر ہی بچے کی حفاظت نہیں کرتی بلکہ خود ماں بھی اپنی اولاد کی ہر مصیبت سے حفاظت کرتی ہے۔خود پریشانیاں سہتی ہے لیکن بچے کو اپنے آنچل میں چھپا کر ممتا کے سائے تلے آرام پہنچاتی ہے اور ہمیشہ اپنے اولاد کا ساتھ ہر دکھ سکھ میں دیتی ہے:

ہوا دکھوں کی جب آئی خزاں کی طرح
مجھے چھپا لیا مٹی نے میری ماں کی طرح

اب بھی چلتی ہے جب آندھی کبھی غم کی رانا
ماں کی ممتا مجھے بانہوں میں چھپا لیتی ہے

مصیبت کے دنوں میں ماں ہمشیہ ساتھ رہتی ہے پیمبر کیا پریشانی میں امت کو چھوڑ سکتا ہے!

بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں۔ان کی شادیاں ہو جاتی ہیں اور نوبت یہاں تک آن پہنچتی ہے کہ گھر تقسیم ہو جاتا ہے تو ماں اکثر چھوٹے بھائی کے حصے میں آتی ہے۔یہ اس کے لیے رحمت کا سبب ہے اور باقی بھائیوں کے لیے طنز کہ:

کسی کو گھر ملا حصہ میں یا کوئی مکاں آئی
میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا میرے حصے میں ماں آئی

اولاد کو بھی اپنی ماں سے محبت اور شفقت ہوتی ہے۔ماں کی صورت دیکھنا جنت کے دیدار کے برابر لگتا ہے۔اس کیفیت کو منور رانا نے اس انداز میں بیان کیا کہ:

مجھے بس اس لیے اچھی بہار لگتی ہے
کہ یہ بھی ماں کی طرح خوشگوار لگتی ہے

مختصر یہ کہ منور رانا نے اپنی شاعری کے ذریعے ماں کی ممتا، دعاؤں، کیفیات، جذبات اور رشتہ شفقت کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ان کی شاعری کو پڑھ کر ماں سے عقیدت اور محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔جو ماں کی ممتا اور قربانیوں کو بھول گیا ہے، اگر وہ ان کی شاعری کو پڑھے گا تو یقینا وہ اپنے کئے پر پشیمان ہوگا۔موجودہ دور میں جہاں ماں باپ کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا ہے وہاں ایسی شاعری کی قدر و منزلت اور بڑھ جاتی ہے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین اخلاقی اقدار کا پرچار کرتی ہو:

آنکھوں سے مانگنے لگے پانی وضو کا ہم
کاغذ پر جب بھی دیکھ لیا ماں لکھا ہوا

☆☆☆



فوٹو تعزیتی پروگرام پروفیسر فضل امام رضوی

عبدالحئی پیامؔ انصاری: ایک تاثر

ڈاکٹر شکیل احمد

(ڈومن پورہ چنگی، مئوناتھ بھنجن، 275101 یوپی، Mob. 9236722570)

سنیچر ۲۱ رمئی ۲۰۲۲ء کی صبح ساڑھے دس بجے کے ٹیلی فونک مکالمے سے مضمون کا آغاز کر رہا ہوں۔

''السلام علیکم''۔ ---------- ''میں مئوناتھ بھنجن سے ڈاکٹر شکیل بول رہا ہوں''۔---------- ''دادا سے بات کرنی ہے؟''

''جی ہاں''۔------ ''دادا اب نہیں رہے؟''۔------ ''اناللہ.... مگر کب یہ حادثہ ہوا''؟۔ ''عید کے روز رات گئے، اگلے دن جنازہ ہوا''

''آپ کے دادا دل کے مریض تھے، کیا اچانک پھر اٹیک ہوا تھا؟''۔---- ''نہیں، سانس لینے میں اچانک دقت ہوئی۔ اسپتال تک نہیں پہنچ پائے گھر پر ہی انتقال ہوا''۔---------- ''اللہ مغفرت فرمائے، آپ سبھی لوگوں کو صبر کی توفیق بخشے''۔---------- ''آمین''

میں اس کے آگے کچھ بول نہ سکا۔

گورکھ پور اپنے مخلص دوست ڈاکٹر انعام الحق صاحب سے رابطہ کیا۔ انہیں بھی خاصی تاخیر سے دو ہفتے کے بعد کہیں سے اس سانحہ کا علم ہوا تھا۔ مجھے جب چند منٹ قبل ان کی فراہم کردہ اطلاع پر یقین نہیں آیا تو میں نے بطور تصدیق موبائل نمبر 9453814135 سے رابطہ کیا اور مذکورہ اطلاع کے ساتھ اشکال یقین میں بدل گیا۔ میرے زبان پر پیامؔ انصاری صاحب کے لئے دعائے مغفرت تھی میری ہی طرح ڈاکٹر انعام الحق صاحب کو بھی افسوس بلکہ تعجب تھا کہ شہر سے پندرہ کلومیٹر دور پیر ولی میں ہونے والے اس سانحہ کا علم ہمیں بروقت کیوں کر نہیں ہو سکا، ابھی ایک ہفتہ قبل ۱۴ رمئی ۲۰۲۲ء کو میں نے گورکھ پور کا سفر کیا تھا، شہر اور یونیورسٹی کے احباب سے ملاقاتیں رہیں، شاید میرے ملاقاتیوں کو اس وقت تک اس سانحے کی کوئی خبر نہیں تھی۔

۲۹ راگست ۲۰۲۱ء کو پیام صاحب سے میری آخری ملاقات ان کے دولت کدے پر ہوئی تھی ان کے تنقیدی مضامین اور تبصروں کا مجموعہ ''کسوٹی'' جو یوپی اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا تھا اس کتاب کی رونمائی کی تقریب ان کے دولت کدہ پر ۱۱ بجے ہونا تھی آپ کی دعوت پر راقم بھی وقت سے پہنچ گیا۔ گورکھ پور سے کئی مہمان تشریف لا چکے تھے۔ پروقار تقریب میں آپ کی شاعری کے ساتھ ''کسوٹی'' میں شامل تنقیدی مضامین پر بھی مہمانان نے اظہار خیال فرمایا پر تکلف طعام کے بعد سہ پہر کے وقت میں گورکھ پور پہنچ گیا اس کے بعد آپ سے کئی بار فون پر گفتگو ہوئی۔ دل کا عارضہ تھا۔ علاج چل رہا تھا۔ موسم کا اتار چڑھاؤ بہت جلد صحت پر اثر انداز ہو جاتا کبھی تو ماشاءاللہ خوش کن لہجہ میں گفتگو ہوتی اور کبھی نقاہت سے نبرد آزما ہوتے تو دھیمے لہجے میں حالِ دل سناتے ایک بار فون کیا تو کہنے لگے ''چند روز قبل اسپتال سے واپسی ہوئی ہے دعا فرمائیں۔'' کئی ماہ سے مزاج پرسی اور

خیریت طلبی کا یہی سلسلہ چل رہا تھا۔عمر بھی اسّی برس ہو رہی تھی بیماری اور اس کے اثرات اشارہ کر رہے تھے کہ یہ چراغ سحری کسی بھی وقت گل ہوسکتا ہے۔ یہ خدشہ برابر لگا رہتا تھا آخر کار اچانک منگل اور بدھ یعنی ۳اور ۴ مئی ۲۰۲۲ء کی درمیانی شب میں ساڑھے بارہ بجے کے بعد یہ چراغ گل ہو ہی گیا مگر گل ہوتے ہوتے اپنے پیچھے گہری اداسی ،مایوسی اور پژمردگی بھی چھوڑ گیا۔عید ہر برس آئے گی اور پیام انصاری صاحب کے اہل خانہ و رشتاء اور عزیز رشتہ داروں کو بار بار اداس کرتی رہے گی۔عید کا دن ان ایام میں سرفہرست ہے ۔جو مسلم معاشرے کو اللہ رب العزت نے بطور انعام عطا فرمایا ہے۔ خوشیوں مسرتوں شادمانیوں اور گلے مل کر تہنت کے تبادلے کی شب اگر رنج وغم اور صدمات و شکستگی سے عبارت ہوجائے تو اسے مشیت ایزدی کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔

آپ کے اکلوتے صاحب زادے محمد اعظم ایڈوکیٹ صاحب کے مطابق عید کی صبح حسب معمول تیاری کے بعد عید کی نماز کے لئے عیدگاہ تشریف لے گئے۔ واپسی کے بعد گھر آ کر عید کی خوشیوں میں شریک اور ملاقاتیوں اور اہل خانہ کے درمیان خوش وخرم رہے۔ دن گزر گیا۔عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد تک بفضلہٖ تعالیٰ سب کچھ ٹھیک تھا۔ سونے کے لئے بستر پر گئے۔تھوڑے وقفے کے بعد سانس لینے میں پریشانی بتائی جب نیبولائزر استعمال سے بھی افاقہ نہیں ہوا تو فوراً آکسیجن کا سہارا لیا گیا لیکن اس کے استعمال سے بھی کوئی خاص آرام نہ مل سکا۔ دوا علاج کے دوران آپ کی زبان اللہ اللہ کا ورد کرتی رہی پورا گھر مصروف دعا تھا کہ رات کے ساڑھے بارہ بجے آپ نے جان،جان آفریں کے سپرد کردی۔انا للله و انا علیه راجعون۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین

عید کی مسرتیں اور شادمانیاں یکا یک آہ و بکا میں بدل گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچوں اور بڑوں کے چہرے سے عید کی خوشیاں روٹھ گئیں۔ ڈبڈباتی آنکھیں،مصروف دعا ہونٹ اور اچانک صدمہ سے دو چار دل کو قابو میں کرتے کرتے صبح ہوگئی۔ ہر دن کی صبح سے بالکل مختلف صبح۔ پاس پڑوس میں خاموشی اور اداسی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اجالا ہوتے ہوتے عزیز و واقارب کی آمد اور تعزیت وتسلی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بعد نمازِ عصر سوگواروں اور پس ماندگان کی ایک بڑی تعداد نے نمازِ جنازہ ادا کی۔ آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ یوں نہ صرف پیرولی قصبے بلکہ گورکھ پور کے ادبی ماحول میں ایک نیک سیرت انسان ،خوش فکر شاعر اور قلم کار کی دائمی جدائی کی تاریخ رقم ہوگئی۔آپ نے اسّی (۸۰) برس قبل جس گھر میں آنکھ کھولی جس گاؤں کی مٹی میں کھیل کود کر بڑے ہوئے،تعلیم کے مراحل سے گزرنے کے بعد وزارت دفاع میں،ڈپٹی کنٹرولر آف ڈیفنس اکاؤنٹس کے عہدے تک پہنچے، ملازمت سے سبک دوشی کے بعد پھر گاؤں کی یہی مٹی انہیں کھینچ لائی۔آج اسّی برس کی عمر میں عید کے اگلے دن آپ اسی گاؤں کے قبرستان میں پیوند خاک ہوگئے۔'' آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے''۔آمین

پیامؔ انصاری صاحب سے میری شناسائی ''گلبن'' لکھنؤ کے توسط سے ہوئی۔ آپ کی نگارشات اس جریدے میں پابندی کے ساتھ شائع ہوتی رہتی تھیں۔ ''گلبن'' اپنے قلمی معاونین کے پورے پوسٹل ایڈریس کے ساتھ موبائل نمبر بھی شائع کرتا تھا۔ جب بھی آپ کی تخلیق شائع ہوتی فون سے اس کے بارے میں بے آمیز گفتگو ہوتی اس طرح میں ان کے حلقہ احباب میں شامل ہوگیا۔ اس دوران آپ کا تیسرا شعری مجموعہ ''تازہ ہوا'' رجسٹرڈ ڈاک سے موصول ہوا یعنی دوستی پکی ہوگئی۔''تازہ ہوا'' کے بارے میں خاکسار نے جو بھی اظہار خیال کیا وہ ''ہوا کے دوش پر''یعنی ٹیلی فون پر ہی ہوا۔ چند ماہ بعد،آپ کا فون پہلے آیا اور'' دوائے دل'' کا کمپوز شدہ مسودہ رجسٹرڈ ڈاک سے پیچھے پیچھے۔ پہلے زبانی پھر تحریری درخواست کے ساتھ کہ''راقم بطور پیش لفظ اپنے خیالات کا اظہار چند صفحات میں کر دے'' میں نے رجسٹری کی دستیابی کے ساتھ پیام صاحب سے چند ہفتے کی مہلت مانگی تاکہ ان کے حکم کی تعمیل ہوسکے۔ بحمد للہ مقررہ وقفہ میں آپ کے حکم کی تعمیل ہوگئی۔آپ نے میری ''تحریرِ شکستہ'' کو ''دوائے دل'' کے اولین صفحات میں جگہ دی۔ اس طرح آپ سے ہونے والی پکی دوستی،گاڑھی بھی ہوگئی۔

۲۰۱۸ء میں خاکسار نے اپنی سوانحی کتاب ''حسابِ جاں'' آپ کی خدمت میں ارسال کی۔بعض سوانحی مماثلتوں کے باعث آپ کو یہ کتاب پسند آئی۔ چند ماہ بعد پھر ایک رجسٹرڈ لفافہ موصول ہوا جس میں تبصرے کے ساتھ ایک خط بھی موجود تھا جس میں چھ سات دہائی قبل مشرقی یوپی کے دستکاروں کے ملتے جلتے حالات وکوائف کا ذکر تھا جو آزادی

سے ذرا قبل اور فوراً بعد اس دیار میں عام تھے ۔اس تبصرے سے ہماری پکی، گاڑھی، دوستی، پختہ تر ہوگئی۔ ''گلبن''، لکھنؤ میں ''حسابِ جاں'' پر محترم سید ظفر ہاشمی صاحب کا تبصرہ شائع ہوا تو اس کی پسندیدگی کا پہلا فون پیامؔ صاحب کا ہی آیا اور ہم ہاشمی صاحب کے تبصرے اور انداز نگارش کے تعلق سے دیر تک گفتگو کرتے رہے خاکسار کو مسرت اس بات کی بھی تھی کہ پیام صاحب نے از خود ''حسابِ جاں'' پر تبصرہ رقم کر کے مرحمت فرمایا تھا مزید شادمانی اس وقت ہوئی جب اپنی تنقیدی کتاب'' کسوٹی''، میں بھی اس تبصرہ کو شامل فرمایا۔

۷ رفروری ۲۰۲۱ء کی صبح آپ کا فون آیا ، کہنے لگے ''ان شاءاللہ گیارہ بجے کے آس پاس میں مئو پہنچوں گا''، میں نے خوش آمدید کہا اور ملاقات کی جگہ دریافت کی۔ تفصیل کے مطابق پیامؔ صاحب کو فضاؔ ابن فیضی گیٹ ڈومن پورہ یعنی میرے محلے میں تشریف لانا تھا۔ سڑک اچھی نہ ہونے کے باعث، بارات قدرے تاخیر سے پہنچی خاکسار کو ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے میری التجا قبول فرمائی اور شام چار بجے غریب خانہ پر تشریف لائے۔ گھنٹہ بھر کی گفتگو میں مقامی استاذ شعراء گمان انصاری اور اظہر سلیم صاحبان بھی شریک رہے جہاں اردو شعر و ادب اور رسائل و کتب بھی موضوع گفتگو رہے۔ مجھے غیر متوقع طور پر پیامؔ انصاری صاحب کی مئو ناتھ بھنجن تشریف آوری اور بے حد خلوص و محبت کے ساتھ غریب خانہ تک قدم رنجہ فرمانے کی دلی مسرت ہوئی۔ کیونکہ قدرے تفصیلی گفتگو کا یہ پہلا موقع تھا۔ حالانکہ اس سے ڈیڑھ برس قبل آپ سے پہلی ملاقات گورکھ پور میں سرسری انداز میں ہوئی تھی جب ہم دونوں ایک دوسرے کے صورت آشنا بھی نہیں تھے۔ لیکن پہلے سے طے شدہ وقت جگہ اور تاریخ پر آپ موجود تھے اور میں چند منٹ بعد پہنچا اس لئے علیک سلیک کے ساتھ ہی ہم ٹوٹ کر ملے۔ ڈاکٹر غیاث الدین صاحب (پیتھالوجسٹ) کی پیتھالوجی سے پیامؔ صاحب کو ایک ٹیسٹ کی رپورٹ لینی تھی اور مجھے اپنی تازہ کتاب ڈاکٹر صاحب کو پیش کرنی تھی۔ (ربِّ کریم ڈاکٹر غیاث الدین صاحب کو غریق رحمت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ کرونا نے کیسے کیسے گنج ہائے گراں مایہ کو ہم سے چھین لیا) اس مختصر سی پہلی ملاقات میں ہم دونوں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ساتھ ان کی پیتھالوجی میں چائے نوش فرمائی۔

پیامؔ انصاری صاحب کا وطن گورکھ پور اور مکمل تعلیم بھی گورکھ پور کی ہی تھی آپ نے گورکھپور یونیورسٹی سے بی کام کیا اور سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوگئے۔ اُردو آپ کی مادری، گھریلو اور اظہارِ خیال کی زبان تھی۔ یونیورسٹی اور ملازمت میں اُردو سے تعلق نا کے برابر تھا۔ لیکن اردو کی خوش قسمتی کہیئے کہ اسے ایسے ایسے چاہنے والے ملے جن کی تعلیم اور ملازمت میں اردو شامل تو نہیں تھی لیکن ذاتی جذبہ و شوق نے انہیں اردو کا عاشقِ زار بنا دیا تھا۔ نام گنانے کی ضرورت نہیں۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور مشتاق احمد یوسفی جیسے سینکڑوں ایسے عاشقانِ اردو ہیں۔ جنہوں نے اردو کی روٹی نہیں کھائی لیکن اس زبان کی ترویج و بقا اور تحقیق و تنقید میں یادگار خدمات پیش کیں۔ پیامؔ انصاری صاحب بھی انہیں حضرات میں سے ایک تھے۔ محکمۂ ڈیفنس کے اکاؤنٹ شعبہ کی ملازمت، کامرس اور معاشیات کے طالب علم مگر اردو کے شاعر، نثار اور سچے خادم۔ اردو سے ایسی بے لوث محبت کرنے والے اور جی جان سے اردو کی بقا اور ترقی کے لئے ہمہ وقت سرگرم رہنے والے بہت کم ملیں گے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اردو کی خدمت گزاری میں مزید تیزی آ گئی۔ شعری اور نثری نگارشات ایک ایک کر کے شائع ہوتی رہیں ادبی حلقوں میں آپ کا قد بلند ہوتا رہا دوسری طرف محلہ پڑوس کے بچوں کو اعزازی طور پر بُلا بُلا کر اردو بھی پڑھاتے اور لکھاتے رہے یہ تھا جذبہ و شوق اردو زبان و ادب سے پیام انصاری صاحب کا۔

آپ نے اگرچہ شہر سے قدرے فاصلے پر، شہری ہماہمی سے دور قصباتی ماحول میں سبک دوشی کے بعد بقیہ زندگی گزاری لیکن اردو دنیا، کتاب و رسائل کے ماحول اور گورکھپور کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں برابر کے شریک رہے۔ ذاتی زندگی میں صالح فکر اور اعتدال پسند رویے کے علم بردار ہے شعری و نثری نگارشات میں یہی طرزِ فکر جلوہ گر رہا آپ کے شعری مجموعوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور انشاءاللہ ابھی اس پر بہت کچھ لکھا جائے گا جبکہ آپ کے نثری اور تنقیدی خیالات کتابی صورت میں ذرا بعد میں آئے اور ''کسوٹی'' کی صورت میں اس وقت شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پہنچے جب آپ اسّی کی عمر کو پہنچ رہے تھے۔ جب کہ یہ مضامین برسوں پہلے رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ آپ نے ملازمت کے دوران ملک کے اہم شہروں میں زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا تھا۔ اس کے طفیل شاعری کی طرح آپ کی نثر میں بھی صاف گوئی اور شائستگی، شستگی اور میانہ روی کے اوصاف یکجا ہو گئے تھے دیگر شعراء و ادباء کی نگارشات اور ان کے تخلیقی رویے پر اظہار خیال میں یہ خوبی صاف جھلکتی ہے۔ اس ضمن میں چند اقتباسات پیش کر کے آپ کی تنقیدی

کتاب ''کسوٹی'' کی ادبی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرر و ریڈر ہوئے، تحقیق وتنقید اور تدریس کی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا آپ کی شاعری کی شہرت میں آپ کی مشہور نظم ''پاگل کوّے'' کو خاصی اہمیت دی گئی۔ پیامؔ صاحب نے اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے سلام صاحب کی ذاتی زندگی اور نظم کی فضا میں چھائی ہوئی یاسیت پر غور کیا اور دوٹوک انداز میں اپنی رائے ان جملوں میں پیش کی:

''مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر سلام سندیلوی جو گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے لیڈر کے عہدے سے رٹائر ہوئے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انہیں صرف آنسو ہی آنسو ملے، صرف غم ہی غم ملے، ترقی کے اتنے منازل طے کرنے میں کیا انہیں کبھی خوشی کا احساس نہیں ہوا تقریباً ۳۸ کتابوں کے خالق تھے، کیا اردو دنیا نے ان کی ستائش نہیں کی اتنی اونچی پوسٹ پر فائز شخص کے ملنے جلنے والے کیا کم رہے ہوں گے؟..... یہ ممکن نہیں کہ ایسے شخص کے رشتہ داروں نے ان سے کوئی تعلق نہ رکھا ہو اگر ایسا ہی تھا تو پھر اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت تھی۔'' (کسوٹی ص ۹۳)

''حسابِ جاں'' کے تجزیہ میں یہی انداز تحریر مزید شگفتہ ہو جاتا ہے کتاب کے مصنف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کہتے ہیں محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی، مشکلوں نے انہیں تجربوں کا بے بہا سرمایہ عطا کیا جسے انہوں نے قوم کی بہبودی کے لیے لٹا دیا'' اگر کہیں پروفیسر ہو گئے ہوتے تو ممکن ہے خود میں سمٹ کر رہ جاتے۔''

(''کسوٹی''، صفحہ ۹۷)

تمثیلی انداز نگارش کا عمدہ نمونہ ذیل کے اقتباس میں ملاحظہ فرمائیں

''ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کا تنقیدی و تخلیقی شعور'' کے تحت لکھتے ہیں:

''گھروں میں حفاظت سے رکھی ہوئی اشیاء، اناج وغیرہ یا پہننے اوراوڑھنے کے کپڑے وغیرہ جو صندوقوں اور الماریوں رکھے جاتے ہیں اگر زیادہ دن تک استعمال نہ ہوں تو ان میں پھپھوند لگنے لگتی ہے..... اسی لیے انہیں کبھی کبھی دھوپ دکھائی جاتی ہے تا کہ یہ اشیاء پھر سے تازہ ہو جائیں اور برباد ہونے سے بچ جائیں۔ اسی طرح ادبی تخلیق کو اگر تحقیق، تنقید، تبصرہ اور مقالوں کی دھوپ نہ دکھائی جائے تو اچھی سے اچھی تخلیق گمنام اور برباد ہو کر رہ جائے گی''۔

(''کسوٹی''، صفحہ ۱۱۱)

اپنے ہم وطن ظفر گورکھپوری کی شخصیت اور شاعری کے تعلق سے پیام صاحب نے چند جملوں میں کئی معنی خیز باتیں کہہ ڈالیں:

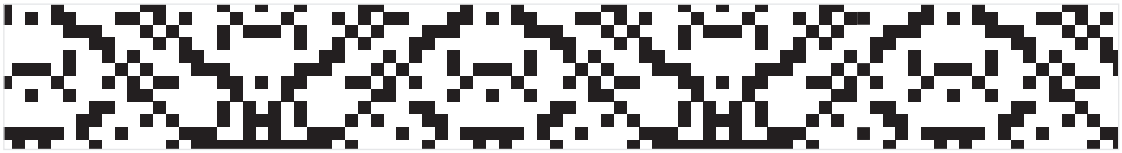
''ظفر گورکھپوری ممبئی میں جسمانی طور پر ضرور رہے لیکن جڑیں گاؤں کی مٹی میں پیوست تھیں۔ گاؤں ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ مٹی کی یہ خصلت ہے کہ جو بھی اس سے جڑتا ہے، اسے نوازتی ہے۔ دانہ مٹی میں مل کر گلزار ہو جاتا ہے ظفر گورکھپوری مٹی سے مل کر سونا ہو گئے..... ان کی شاعری کا سب سے بڑا وصف اور انفرادیت یہ ہے کہ اس میں سے گاؤں کی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک ملتی ہے۔

(''کسوٹی''، صفحہ ۱۶۲-۱۶۳)

مذکورہ اقتباسات کو نقل کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ پیام صاحب کی شاعری جو چار شعری مجموعوں میں یکجا ہو کر ادبی حلقے میں آپ کو متعارف کرا چکی ہے، ان کی نثر نگاری کی ایک جھلک اس تاثراتی مضمون میں پیش کر دی جائے کیونکہ آپ کی نثری کتاب ''کسوٹی'' کے نام سے ۲۰۲۱ء میں شائع ہوئی جس سے ادبی حلقہ قدرے کم واقف ہے افسوس کہ اس کتاب کی اشاعت اور اجراء کی تقریب کے آٹھ ماہ بعد ہی آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے پیچھے سوگواروں کی بہت بڑی تعداد چھوڑ گئے جن میں آپ کے اہل خانہ، عزیز و اقارب کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا میں آپ کے جاننے والوں کی بہت بڑی تعداد بھی شامل ہے۔

پیامؔ انصاری صاحب نے فعال اور بھرپور زندگی گزاری ملازمت کے سلسلہ میں ملک کے کئی شہروں میں مقیم رہ کر اپنی شاعری کے لیے تجربات بھی یکجا کرتے رہے اور ان شہروں کے ادب نواز اشخاص سے کسب فیض کر کے اپنی شاعری کو سنوارتے، نکھارتے اور اردو کی بے لوث خدمت کرتے رہے آپ زندگی بھر اُردو سے محبت کرتے رہے جس کے نتیجے میں اپنے پیچھے اُردو سے واقف بھرپور کنبہ اور اردو کتب و رسائل کا قیمتی ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے اس علمی اثاثہ کو ترتیب دے کر شائع کرایا جائے جو ابھی اشاعت سے محروم ہیں یہ ایسا علمی کام ہے جو فوری توجہ چاہتا ہے کیونکہ تاخیر کی صورت میں اس کے ضائع ہو جانے اور بے فیض رہ جانے کا خدشہ بہر صورت باقی رہے گا۔ پیامؔ انصاری صاحب کی غیر مطبوعہ نگارشات کی اشاعت ان کے لیے ایک خراج عقیدت بھی ہوگا۔

☆☆☆



ادبِ اطفال کے فروغ میں متین اچل پوری کا حصہ

حُسین قُریشی

(ریسرچ اسکالر، بامو یونیورسٹی، اورنگ آباد، مہاراشٹر۔ Mob. 9850155656)

ادب کے فروغ اور ارتقاء میں ریاستِ مہاراشٹر کا ایک بڑا حصہ ہے۔ یہاں ادب کی تمام اصناف پر مختلف ادباء وشعراء نے بھرپور طریقے سے دادِ سخن دیا ہے اور ان کی یہ خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ مہاراشٹر کے نقشے میں علاقہ ودربھ تقریباً وسط میں موجود ہے۔ یہ اپنی زرعی اور صنعتی پیداوار کے ساتھ ساتھ ادب کے مختلف اصناف میں بھی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سرزمینِ ودربھ نے کئی ایسی شخصیات کو جنم دیا ہے جنھوں نے ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اس کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی اپنی قابلیت، صلاحیت، تجربات، مشاہدات اور ذہانت کے جوہر دکھائے ہیں اور ناول، ناولٹ، افسانہ نگاری، افسانچہ نگاری اور شاعری کے ساتھ ساتھ ادبِ اطفال میں بھی اپنی ہنرمندی کے ثبوت پیش کیے ہیں۔ ودربھ کے ان ہنرمندوں میں عبدالستار فاروقی، قادری نیازی، فیض انصاری، ریاض رؤفی، متین اچل پوری، عبدالرحیم نشتر، غنی غازی، حبیب ریتھ پوری، ڈاکٹر اشفاق احمد، ماسٹر عثمان ناظر، نواب رونق جمال، شارق نیازی، طفیل سیماب، نواب تقی علی، حنیف فاتح، ڈاکٹر محمد ابوالکلام، سلمیٰ نسرین، زہرہ جمال، ڈاکٹر نگہت ریحانہ، بانو سرتاج، نیلوفر ناہید، ڈاکٹر سرور شہ نسرین، رضیہ مبین اور شفیقہ فرحت کے نام شامل ہیں۔ ان فنکاروں میں سے بعض نے تو کئی کئی اصناف میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ انھوں نے جہاں ادب عالیہ میں اپنی تخلیقات پیش کی ہیں، وہیں ادب اطفال کو پروان چڑھانے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے۔ بچوں کے لئے سبق آموز کہانیاں، اخلاقی اور سائنسی نظمیں، پرترنم گیت اور غزلیں سبھی کچھ ان کے قلم سے نکلی ہیں۔ ان تخلیق کاروں میں ایک اہم نام متین اچل پوری کا ہے۔

متین اچل پوری کا اصل نام محمد متین ابن شیخ محمد ہے۔ والدہ کا نام حنیفہ بانو ہے۔ 18 جنوری 1950 کو اچل پور ضلع امراوتی (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت اچل پور کے مقامی اسکول میں ہوئی۔ نو برس کی عمر میں ہی والدین خالقِ حقیقی سے جا ملے اور ان کے سر سے سایہ محبت اٹھ گیا۔ اس واقعہ نے ان کے دل ودماغ پر گہرا اثر ڈالا، مگر انھوں نے اپنی ہمت برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی جاری رکھی اور سنت گاڈگے بابا یونیورسٹی امراوتی سے ایم اے کا امتحان یونیورسٹی ٹاپر کے طور پر پاس کیا۔ جس کا چرچا ہر سو ہوا۔ اتنا ہی نہیں، انہوں نے بی ایڈ کی ڈگری بھی سن 1980 میں اول درجے سے حاصل کی۔ سن 1990 سے 2007 تک تدریس کے پیشے سے وابستہ رہ کر قوم کے نونہالوں کو تراشنے کا کام کیا۔ ضلع پریشد اردو مڈل اسکول اور ضلع پریشد ہائی اسکول میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ دورانِ تدریس آپ ادب سے وابستہ ہوئے۔ وجہ بنے ابن صفی۔ ابن صفی کی صاف ستھری زبان نے متین اچل پوری پر ایک خاص تاثر چھوڑا اور ان کو ادب کی جانب راغب کیا۔

متین اچل پوری کی ادبی زندگی کا آغاز لڑکپن میں ہی ہوگیا تھا۔ پہلے ناول اور کہانیوں سے ابتداء کی اور بعد میں 1970 سے شاعری میں طبع آزمائی کی۔ پھر آپ نے ادب اطفال کی طرف رخ کیا اور مختلف ماحولیاتی، سائنسی اور ٹیکنالوجی سے متعلق عنوانات کو موضوع سخن بنایا۔ آپ تصنیف "لاڈلے جانور" میں بچوں کو جانوروں کے متعلق مؤثر انداز میں معلومات فراہم کی گئی ہے۔ "ماحول نامہ" میں آپ نے بچوں کو سرسبز وشاداب ماحول سے متعارف کرایا ہے۔ "یتیم کی آواز" میں بچوں کے احساسات وجذبات کی ترجمانی کرنے والی کہانیاں شامل ہیں۔ ان سب کے علاوہ بھی آپ کی دیگر شعری و نثری تخلیقات مختلف قومی و ریاستی سطح کے اخبارات و رسائل کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ جس پر آپ کو کافی پزیرائی بھی ملتی ہے۔ آپ نے ادبی سیمیناروں اور مشاعروں میں ودربھ کی کامیاب نمائندگی کی ہے۔ دورِ حاضر کے نمایاں ادباء، شعراء، مصنفین اور مبصرین نے آپ کی تخلیقات پر تبصرے، تجزیے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جو مختلف رسائل و اخبارات میں شائع بھی ہوئے۔ جیسے محمود شیخ نے "متین اچل پوری اور بچوں کی کہانیاں" اور عبدالاحد ساز نے "متین اچل پوری کی شعری تصنیف "تجلی زار" جیسے عناوین کے تحت اپنے خیالات مرتب کئے ہیں۔ متین اچل پوری کی ادبی خدمات کے پیش نظر ماہنامہ "شاعر" ممبئی نے نومبر 2016 میں اور ماہنامہ "گلشن اطفال" (مالیگاؤں) نے اپریل 2016 میں آپ پر خصوصی گوشے شائع کیے۔ آپ کی شخصیت اور ادبی خدمات حوالے سے تفصیلی انٹرویو افتخار امام صدیقی نے کیا تھا جو ماہنامہ شاعر، ممبئی کے نومبر 2016 کے خصوصی شمارے میں "بچوں کے لئے ہمہ اصناف گبرو قلم کار: متین اچل پوری" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ 52 سالانہ ادبی ریاضت کے اعتراف میں آپ کو مختلف انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ بچوں کے تئیں آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند کی جانب سے سن 1990 میں نیشنل ایوارڈ بہ دست صدرِ جمہوریہ ہند عطا کیا گیا۔ اس کے علاوہ سن 1980 کا جواہر لال نہرو یونیورسٹی کا اعزاز اور سن 1988 میں ضلع امراوتی کا مثالی معلم ایوارڈ اور آپ کی کتب "قلم کے موتی" اور "حرفوں کا پیغام" کو حاصل سن 2008 میں حکومتِ مہاراشٹر اور اتر پردیش اردو اکیڈمی کے انعامات اہم ہیں۔

متین اچل پوری نے بچوں کی شخصیت نکھارنے کے لئے مؤثر نظمیں بھی کہی ہیں۔ ذیل کی نظم "تتلی اور طالب علم" میں ملاحظہ کیجئے دونوں کی گفتگو کو کس مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نظم میں ایک طالب علم نے اپنی سچی دوست کتاب کی تعریف کی ہے تو وہیں تتلی نے اپنے دوست "گلاب" خصوصیات بیان کی ہے۔ شاعر نے نظم کے آخر میں "کیا خزاں علم پر کبھی آتی؟" جیسے سوالیہ جملے سے بچوں کے معصوم ذہن پر ایک کامیاب نقش چھوڑنے کی کوشش کی ہے جو اسے آگے چل کر کتاب کی طرف مائل کرنے پر ابھارے گی:

تتلی اور طالب علم

تتلی: میں فدا اپنے اس گلاب پہ ہوں
طالبعلم: میں فدا اپنی اس کتاب پہ ہوں
تتلی: حسن اس کا مجھے لبھاتا ہے
طالبعلم: اس کا ہر لفظ مجھ کو بھاتا ہے
تتلی: دیکھ میرے گلاب کا جادو
طالبعلم: دیکھ میری کتاب کا جادو
تتلی: اس کی خوبی پہ ہوں میں اتراتی
طالبعلم: کیا خزاں علم پر کبھی آتی؟

متین اچل پوری نے اپنی تخلیقات میں بچوں کے آس پاس کے ماحول کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی تخلیقات نے بچوں کو اپنی جانب راغب کیا ہے۔ وہ بڑے ہی آسان زبان میں اور کم الفاظ میں شعر کہتے ہیں۔ ایک نظم میں "تازہ ہوا" پر آپ نے اس انداز میں اپنے خیالات کو پیش کیا ہے کہ ذہن اس کی جانب از خود لپکنے لگتا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

تازہ ہوا کی بات نرالی
میرے خدا کی بات نرالی

تازہ ہوا ہے سب کی ضرورت
ہر پل ، ہر لمحے ، ہر صورت
بھر دیتی ہے تن میں چستی
نو دو گیارہ ہوتی سستی
تازہ ہوا کلیوں کو کھلاتی
ہر جانب خوشبو پھیلاتی
ذہن بھی اپنا ، ایسی کیاری
سب سے اعلیٰ، سب سے پیاری
تازہ ہوا ہے ، اس کی ضرورت
پہنچائیں اس کو ہر صورت
ایسی ہوا ہر روپ میں ملتی
چھاؤں میں ملتی، دھوپ میں ملتی
نوکِ قلم سے چلنے والی
لفظوں میں ہے ڈھلنے والی
فطری شاعر کو ٹوکیں کیوں
اس کو کہنے سے روکیں کیوں
خوب ہنر دکھلانے دیجیے
تازہ ہوا کو آنے دیجیے

متین اچل پوری کی نظموں میں جدیدیت ، اپڈیشن اور دورِ حاضر کے عنوانات بکثرت ملتے ہیں۔عنوانات میں تسلسل، مرکزیت اور ربط نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر آپ نے پچھلے سطور میں "تازہ ہوا" کے عنوان سے نظم ملاحظہ کی ہے تو اسی ضمن میں ایک دوسری نظم بھی دیکھتے چلیں، جس کا عنوان ہے "آکسیجن" :

آکسیجن ! شان تیری خوب ہے
تو ہر اک انسان کی محبوب ہے
لازمی تو سب کے جینے کے لیے
جان کے ہر آبگینے کے لیے
پاتے ہیں سب تجھ میں ممتا کی چھبی
منہ کسی سے بھی نہیں موڑا کبھی
بچے بچے نے حقیقت جان لی
مہرباں صورت تری پہچان لی
سرحدیں کب روک پائی ہیں تجھے
طاقتیں کب روک پائی ہیں تجھے
گورا کالا ہر کوئی تیرا مرید
ادنی اعلیٰ ، ہر کوئی تیرا مرید
کوئی پل بیتا نہیں تیرے بغیر
تیرے دم سے گذری ہیں صدیاں بخیر
کرتی ہے کورونا سے سب کو بری
تیرے کارن رت یہ بیتی دکھ بھری
تو نے پوچھی کب کسی کی ذات پات
بانٹتی پھرتی ہے تو سب کو حیات
اک ترا ممنون ہر انسان ہے
واقعی ! اللہ کی یہ شان ہے

قاری ملاحظہ کرسکتا ہے کہ متین اچل پوری کی اس نوع کی نظموں کے توسط سے بچوں کے دماغ میں سائنسی معلومات کو مستحضر کرنے میں بڑی آسانی مل سکتی ہوجاتی ہے۔ابھی ان کا ادبی سفر جاری ہے۔حالانکہ ان کی بہت سی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں اور بہت سی کتب ابھی زیر طبع ہیں۔اس لیے امید کی جاتی ہے کہ وہ اسی طرح بچوں کے ذہن میں عصری موضوعات کو نقش کرنے کی اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔ان کے شعری ونثری کتب کے نام کچھ یوں ہیں:

اکشر دھارا کے گیت (1991ء) ، حرفوں کا پیغام (2007ء)، عکس رواں (2015ء)، جلی زار (2016ء)، یتیم کی آواز (2016ء)، دنیا کی ضرورت بن جاؤں، کام کے گیت، صحرا میں نخلستان، ممتا کی ڈور (2020ء)، ماحول نامہ (زیر طبع)، بنتِ حوا کی فریاد (زیرِ طبع)، نقشِ نوک قلم (زیر طبع)۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی تصانیف کا کافی کچھ حصہ کتابی صورت پر منظر عام پر بھی آچکا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ نسخۂ کیمیائے محبت کی طرح ابھی ان کی زنبیل میں محفوظ ہے۔

متین اچل پوری نے اپنی تخلیقات میں بچوں کے مابین مذہبی، سماجی، قومی، ملی، نفسیاتی اور اخلاقی دروس دے کر ان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے مؤثر مواد قلم بند کیا ہے۔انھوں نے اپنے کلام میں دور حاضر کے مسائل کو پیش کیا تو کبھی سماجی، معاشی، مذہبی اور اخلاقی اقدار کی دعوت دی۔آپ نثری وشعری اصناف میں جدت کو پسند کرتے ہیں۔آپ کی تخلیقات نہ صرف بچوں، بلکہ نوجوانوں اور بزرگوں کی بھی رہنمائی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر احسان عالم کا فن: ''بچوں کے سنگ'' کی روشنی میں

ڈاکٹر ریحان احمد قادری

(اسسٹنٹ پروفیسر (گیسٹ فیکلٹی) سب ڈویزنل گورنمنٹ کالج، بیلی پور، دربھنگہ Mob. 9031201641)

احسان عالم کا شمار نئی نسل کے ابھرتے ہوئے ادیب، مضمون نگار اور مبصر کے طور پر ہوتا ہے۔ اور ایسی مرنجان مرج شخصیت کے حامل ہیں کہ ان کی وابستگی دنیائے ادب کے ایک ایک قابل شخص کے ساتھ لازماً ہے۔ شاید اسی لیے ادب کا کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو ڈاکٹر احسان عالم کو نہ جانتا ہو۔ مضمون نویسی، تنقید نگاری اور تبصرہ نگاری ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کی تعلیم سائنس سے ہوئی لیکن ادب کو اپنا کر دوسروں کو اردو زبان کا فیض پہنچا رہے ہیں۔ انہوں نے میٹرک سے لے کر پی ایچ۔ ڈی تک کی ڈگری حاصل کی ہے۔ انہوں نے اب تک تقریباً پندرہ کتابیں تحریر کی ہیں۔ ساری کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جو ۲۰۱۵ء سے لے کر ۲۰۲۰ء تک کے درمیان کی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی چار کتابیں زیر طبع ہیں۔ اردو زبان و ادب سے ان کے لگاؤ کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ ادب سے شروعاتی دور سے تعلق نہ رکھتے ہوئے بھی مسلسل اردو میں لکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ۲۰۰ سے زیادہ مضامین بھی قلمبند کئے ہیں جو ہندوستان کے مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ حالیہ دنوں میں انہوں نے ادب اطفال سے متعلق ایک قابلِ ذکر کتاب ''بچوں کے سنگ'' کے نام سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ۲۰۱۹ کے اواخر میں منظر عام پر آئی۔ کتاب برائے مطالعہ راقم کو بھی ملی۔ مصنف نے تین حصوں میں کتاب کو تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں انہوں نے بچوں کے کردار کو سنوارنے والے رشتوں پر چار مضامین قلمبند کئے ہیں۔ دوسرے حصے میں بچوں کے لئے چند ضروری ہدایات کے ذیل میں ۱۴ مضامین قلمبند کئے ہیں۔ تیسرے حصے میں چند اہم شخصیتیں جن کی زندگی بچوں کے لئے مشعل راہ ہیں، ان پر پانچ مضامین تحریر کئے ہیں۔

ڈاکٹر احسان عالم کا شمار ایک ہر مند فنکار کے طور پر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے فنی باریکی کے ساتھ ''بچوں کے سنگ'' کتاب کو منصۂ شہود پر لایا ہے۔ انتسابِ کتاب پروفیسر منصور عمر (مرحوم) کے اشعار کے ساتھ کیا ہے جو انہوں نے احسان عالم کی بھتیجی عذرا صدف کے لیے لکھے تھے:

کیا خوب قسمت نے کی یاوری
کھلی باغ ارشاد میں اک کلی
محبت کے سانچے میں گڑیا ڈھلی
مسرّت کو حاصل مسرت ہوئی
نہ پھولے سماتے ہیں احسان بھی
بہ شکل بھتیجی جو بیٹی ملی

بچے کسی بھی گھر، قوم کے مستقبل ہوتے ہیں جن کا خیال رکھنا ماں باپ کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ایک ذمہ دار انسان بنا سکیں۔ اپنی باتوں کی فکر لے کر مصنف نے یہ کتاب منظر عام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے تا کہ سماجی سطح پر بچوں کو ایک اچھا شہری بنایا جا سکے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ادیب اور معروف مصنف ہیں انہوں نے اس کتاب پر گفتنی کے عنوان سے لکھا ہے کہ:

''بچے رنگ برنگے خوشبودار پھول ہوتے ہیں جنہیں کھلنا اور چاروں طرف خوشبو بکھیرنا ہے۔ ان کی آبیاری اور باغبانی ضروری ہے۔ ڈاکٹر احسان عالم ایک اسکول کے پرنسپل ہیں اور روزانہ انہیں سینکڑوں بچوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان کے حرکات و سکنات کا وہ جائزہ لیتے رہتے ہیں، ان کی نفسیات کو دیکھتے سمجھتے رہتے ہیں اور ان کے مسائل کے تدارک میں لگے رہتے ہیں۔ اپنے ان ہی تجربات کی روشنی میں انہوں نے کتاب ''بچوں کے سنگ'' لکھی ہے۔''

بچوں کے کردار کو سنوارنے والے چند رشتے:

یہ کتاب کا پہلا حصہ ہے۔ جس میں بچوں کا کردار بہتر کیسے بنایا جائے اس پر لکھا گیا ہے۔ اس میں بچوں کے لیے ماں کی اہمیت کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کیا گیا ہے۔ انہوں نے ماں کو مقدم رکھ کر بچوں کی پرورش میں جن کرداروں کا ذکر تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ماں کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ماں بچوں کے لئے ایک اسکول ہے چاہے وہ ماں پڑھی لکھی ہو یا ان پڑھ ہو۔ ہر ماں چاہتی ہے کہ میرا بچہ پڑھ لکھ کر اچھے سے اچھا اور کامیاب انسان بنے تا کہ ان کا نام روشن ہو۔ پھر آخر میں نصیحت بھی ہے کہ کہ بچے اپنی ماں کی قدر کریں تبھی وہ اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ کیونکہ'' ماں کے قدموں تلے جنت ہے''۔ اس لئے اپنی جنت کا احترام کرنا سیکھیں۔ آگے مصنف نے والدین اور اساتذہ کے باہمی رشتہ پر مضمون قلم بند کیا ہے جو کافی عمدہ ہے اس میں اس بات کی طرف دھیان دلایا گیا ہے کہ اگر والدین اور اساتذہ کے رشتے اچھے ہوں گے تو وہ معاشرہ میں بچے کی تربیت اچھے ڈھنگ سے کر پائیں گے۔ کیونکہ بچوں کی عادت سے والدین واقف ہوتے ہیں ۔ ہر اچھے اور بڑے کام اپنے بچے کے بارے میں جانتے ہیں اگر ان کا رشتہ اساتذہ سے اچھا ہوگا تبھی استاد ان بچوں کی خرابیوں کو دور کر سکیں گے۔ استاد کا ان کی ان عادتوں سے باخبر رہنا نہایت ہی ضروری اور اہم ہے۔ دوسری جانب اساتذہ بچوں کی نفسیات کے بارے میں باریک علم رکھتے ہیں۔ لہٰذا دونوں کے ملنے اور تبادلہ خیال کرنے سے بہت سے ایسے نتائج مرتب ہوں گے جو بچے کی زندگی پر خوشگوار اثر ڈالیں گے۔ تعلیم کا مقصد ایک مخصوص نصاب ہے جس میں بچوں کو پاس کرانا ہوتا ہے۔ بچوں کی زندگی کو کڑے امتحان سے گزرنے کے لیے تیار کیا جائے تا کہ وہ علمی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے عملی زندگی کو بھی کار آمد بنا سکیں۔ اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ استاد کا تعلق والدین سے اچھا ہو۔ بچوں کے والدین بھی استاد کی پوری مدد کریں تبھی جا کر وہ بچے سماج کا ایک اچھا انسان بن سکتے ہیں۔

بچوں کی زندگی میں استاد کی اہمیت: اس مضمون میں انہوں نے بچوں کی زندگی میں استاد کی حیثیت کیا ہونی چاہئے اس کا ذکر کیا ہے۔ استاد کی اہمیت، عزت، احترام و آداب، فضیلت وغیرہ کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ استاد کو دنیا سب سے خوش نصیب شخص کہا ہے اور خود بھی وہ ایک بہترین استاد ہیں۔ علم کا درجہ بہت بلند ہے۔ تمام رسولوں اور پیغمبروں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کر کے تمام دنیا کے لوگوں کو علم سے روبہ رو کروایا۔ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اپنے اپنے ساتھ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور صحیفہ لائے آخر کیوں؟ کیونکہ ان سب نے علم کے ذریعہ انسانوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ سے جوڑنا چاہا۔ آخر میں نبی کریم ﷺ نے بھی اپنا وارث علماء کو بنایا تا کہ علم کے ذریعہ لوگ اللہ تعالیٰ کو پہچان سکیں۔ خیر جو شخص علم حاصل کرتا ہے اور اس کو دوسروں تک پہنچاتا ہے اس کو بھی ثواب ملتا ہے۔ جب استاد نہیں تھے تو دنیا میں جہالت اور گمراہی تھی۔ استاد نے ہی اس تاریک دنیا کو علم کی روشنی سے منور کیا۔ علم کی بدولت دنیا کے لوگوں نے اچھے اور برے میں امتیاز پایا۔ تہذیب و تمدن کی روشنی پھیلی۔ اسلام میں استاد کا مرتبہ کافی بلند ہے ہمارے نبی کرم ﷺ نے فرمایا کہ استاد کی حیثیت روحانی باپ کی ہے اس کا حق اپنے شاگردوں پر اتنا ہی ہے جتنا کہ کسی باپ کا حق اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔ استاد کی اہمیت یہ ہے کہ کسی نے انسان کو ایک حرف پڑھایا تو وہ اس کا استاد ہو گیا۔ ہمارے سماج میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جو شاگرد اپنے اساتذہ کی زیادہ عزت کرتے ہیں وہ علم کے میدان میں آگے بڑھ جاتے ہیں اس

کے بر خلاف جو بچے اپنے استاد کا احترام کم کرتے ہیں یا نہیں کرتے ہیں وہ تعلیم کے میدان میں کافی پیچھے رہ جاتے ہیں۔

قوم کی ترقی تعلیم پر منحصر کرتی ہے اور تعلیم کی ترقی استاد کی ذات پر منحصر ہے۔ جو قوم اپنے استاد کی عزت کرنا نہیں جانتی وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی ۔ قومی زندگی میں استاد کی حیثیت اس روشن ستارے کی مانند ہے جو اندھیرے میں مسافر کو راستہ دکھانے کا کام کرتا ہے۔ استاد وہ ہے جس کی مثال چراغ جیسی ہے جس سے ہزاروں چراغ جلائے جاسکتے ہیں۔ اس لیے ہم سب پر استاد کی اہمیت مسلم ہے اور انسان کو چاہئے کہ وہ استاد کا احترام کریں تا کہ اس کی زندگی اچھی ہو۔

استاد کی اہمیت دانشوروں کی نظر میں: ماہر تعلیم کی نظر میں ایک استاد ہونے کی صلاحیت وہ انسان رکھتا ہے جس کے اندر اچھی صحت، وسیع علم، اعلیٰ تجربہ، مکمل ہوش مندی ، سچی خدمت کا جذبہ، صبر وتحمل اور ثابت قدمی کی خوبیاں موجود ہوں۔ تعلیم کا دارو مدار معلم پر ہے اس لیے استاد کا ادب واحترام ایک اچھے اور کامیاب طالب علم کی پہچان مانی جاتی ہے۔ علم حاصل کرنے کے سلسلہ میں ایک حدیث ہے کہ تم تعلیم کو حاصل کرنے کے لئے چین ملک بھی جانا پڑے تو جاؤ۔ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اس کے لیے صبر وتحمل اور قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم حاصل کرنا بڑا ہی مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ علم خدا کا نور بھی ہے، علم گنہگار کو نہیں ملتا اور علم کے قیمتی موتی اس کے ہاتھ آتے ہیں جن کے اندر وقار، سنجیدگی ، حسن وادب ، حصول علم کی تڑپ ولگن، خواہش علم میں خود کو جلانے کا حوصلہ اور استاد کی خدمت کا جذبہ ہو۔ جس طالب علم کے اخلاق اچھے نہ ہوں وہ حصول علم میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ مغرور اور متکبر علم حاصل نہیں کرسکتا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی عظیم لوگ ہوئے ہیں ان تمام نے اپنے استاد کی قدر کی ہے تب اسے علم کی دولت سے سرفرازی حاصل ہوئی ہے۔ میں ان مخصوص لوگوں کا ذکر کرتا چلوں تا کہ آپ بھی ان عظیم الشان خدمت گاروں سے واقف ہوجائیں۔ ان میں اے پی جے عبدالکلام جو ہمارے ملک ہندوستان کے سابق صدر اور مشہور سائنسداں نے اپنے استاد دورائی سولومن کے معاملے میں لکھا ہے ''میرے استاد سولومن نے میری عزت نفس کو ایک بلند مقام تک پہنچادیا۔'' اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اپنے استاد کا نام نہایت قدر واحترام کے ساتھ لیتے رہے۔

دوسرے ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر ہندوستانی آئین کے مصنف کو کون نہیں جانتا ۔ ان کا اصل نام بھیم راؤ تھا۔ امبیڈکر ان کے استاد کا دیا ہوا نام ہے جسے انہوں نے تاعمر اپنے نام کے ساتھ لگائے رکھا۔ آج ساری دنیا انہیں اصل نام بھیم راؤ سے کم اور امبیڈکر کے نام سے زیادہ یاد کرتی ہے۔ تیسرے ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں، جنہیں کون نہیں جانتا۔ آپ بھی ایک مایہ ناز معلم گذرے ہیں اور ہندوستان کے صدر رہ چکے ہیں۔ آپ اپنے استاد کی قدر دل و جان سے کرتے تھے اپنے پرانے اسکول اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے ایک پروگرام میں تشریف لائے تو انہوں نے تمام طلبا کے سامنے اپنے استاد کے بارے میں فرمایا ''حضرات آج میں جو کچھ ہوں صرف اپنے استاد سید الطاف حسین مرحوم سابق ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کی خصوصی توجہ اور محنتوں کا ثمرہ ہوں۔''

مندرجہ بالا تینوں حضرات نے اپنے اپنے استادوں کو قابل احترام سمجھا اور ان کی خدمت دل و جان سے کرتے رہے ان کی خاطر اپنی جان تک کو داؤ پر لگادیا۔ تب جا کر وہ ان کی دعا کے برکت سے اس بلندی پر پہنچے ۔ ہمیں بھی چاہئے کہ ہم اپنے استاد کی خدمت دل و جان سے کریں تا کہ ہم بھی کامیاب و کامران ہوسکیں۔ کیونکہ بغیر استاد کے احترام کے آپ بلند اور اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ فارسی کا ایک مشہور شعر ہے:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے رومؒ
تا غلام شمش تبریزیؒ نہ شد

جس کا مفہوم یہ ہے کہ مولانا روم تب تک مولوی نہ ہوسکے جب تک کہ وہ شمس تبریز کے غلام نہ ہوئے۔

دوسرے حصے میں احسان عالم نے بچوں کے لئے چند ضروری ہدایات کے ضمن میں روشنی ڈالی ہے جن کا عنوان ہے: بچوں کے فرائض۔ فرائض وہ کام ہے جو ہمارے لئے ضروری اور مقدم ہوتا ہے۔ بچے جب اسکول جاتے ہیں اور استاد بچوں کو جو باتیں پڑھاتے ہیں یا سمجھاتے ہیں اس پر بچوں کا عمل کرنا فرض ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ ہمیشہ بچوں کو اچھی باتوں پر عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں تا کہ ہمارے اسکول کے بچے اچھے ہو جب ہمارے اسکول کے بچے اچھے ہوں گے تو ان سے ہمارا سماج اچھا ہوگا، انہیں سب باتوں کی طرف توجہ اس مضمون میں لکھا گیا ہے اور پھر آگے ''بچوں کی کامیابی کا راز'' کے نام سے بھی

ایک مضمون شامل ہے۔ کامیاب انسان ایک دن میں نہیں ہوتا۔ موجودہ دور کافی جدوجہد کا دور ہے زندگی کے میدان میں مقابلہ آرائی ہے۔ ایسے حالات میں بچوں کا کامیاب ہونا ایک بڑا مسئلہ بنتا جارہا ہے کیونکہ آج کے اس دور میں ہر والدین اپنے بچے کو بڑا آدمی، ڈاکٹر، انجینئر، آئی اے ایس آفیسر، پروفیسر، سائنسداں اکاؤنٹنٹ وغیرہ بنانا چاہتے ہیں مگر جب امتحان میں ان کے بچے کو دوسرے سے کم نمبر آتا ہے تب والدین یہ سوچتے ہیں کہ میرا بچہ پڑھنے لکھنے میں کمزور ہے۔ ایسی سوچ سراسر غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک انسان کو ایک جیسا دماغ دیا ہے اور فرق صرف استعمال کرنے کا ہے کچھ بچے اپنے دماغ کا استعمال زیادہ کرتے ہیں تو وہ آگے بڑھتے ہیں اور جو نہیں استعمال کرتے وہ تھوڑا پیچھے رہ جاتے ہیں جس کی مثال تھامس ایڈیشن ہیں کہ ان کو استاد نے ایک خط دیا تھا اور کہا تھا کہ والدین کو دے دینا اور انہوں نے اس خط کو لاکر اپنی ماں کو دیا اور ماں نے ایڈیسن کو الگ سے پڑھا کر ایک کامیاب انسان بنادیا۔ اگر والدین چاہے تو وہ بچوں کو کامیاب کامران کر سکتے ہیں مگر ان کی تربیت بھی ایڈیشن کی طرح کرنی ہوگی اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ بچے خود کو کبھی نکمہ نہ سوچیں۔ ہر بچے میں اللہ نے صلاحیت دی ہے۔ ضرورت ہے ان صلاحیتوں کے صحیح استعمال کی۔

غذا اور بچوں کی صحت: غذا ایک ایسی شئی ہے جس کے استعمال سے انسان کو نئی تازگی ملتی ہے۔ ایک صحت مند جسم میں صحت مند دماغ ہوتا ہے۔ اچھی متوازن خوراک سے طاقت ملتی ہے اور جسم پرورش پاتا ہے۔ جسم اور ذہن کی نشوونما کے لئے اچھی غذا کا انتخاب لازمی ہے۔ بچوں کی جسمانی اور ذہنی نشوونما کے لئے پھل، سبزیاں اور دودھ بہت اہم ہے۔ صاف ستھری اور صحت مند خوراک سے وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تیز ہوں گے۔ ان باتوں کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔

فیس بک اور بچے: فیس بک موجودہ دور کا ایک اہم سوشل ویب سائٹ ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی سائٹ ہیں جیسے ٹیوٹر، انٹر گرام وغیرہ مگر ان میں سب سے زیادہ استعمال فیس بک کا ہوتا ہے۔ اس کے بانی مارک ذکر برگ ہیں۔ انہوں نے صرف ۲۰ سال کی عمر میں اس کو ایجاد کیا تھا۔ آج ہماری دنیا کے لوگ اس کے دیوانے بنے ہوئے ہیں۔ موجودہ دور میں نیٹ کی سہولیات آسانی سے مل رہی ہے۔ موبائل کے ذریعہ بچے انٹرنیٹ کا استعمال روزمرہ کی زندگی میں خوب کر رہے ہیں۔ سوشل سائٹ پر بچے، مرد، عورت اور بوڑھے اپنا اکاؤنٹ بنا کر ایک دوسرے کے دوست بنے بیٹھے ہیں اور اپنی زندگیوں میں آنے والے ہر خوشی، غم، اچھے اور برے تمام وہ کام جو وہ کرتے ہیں اس کی جانکاری فیس بک پر پوسٹ کر لوگوں کی رائے جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں ان کو تمام دوستوں سے رائے، ہمت، حوصلہ، داد وغیرہ ملتا رہتا ہے۔

فیس بک کا استعمال تعلیم حاصل کرنے کے لئے کیا جائے تو ان کے بہت سے فائدہ ہیں۔ فیس بک پر کوئی اپنا اپنا پیج بناتے ہیں اور ان کے ذریعہ حالات حاضرہ، فن، تاریخ، آرٹ، تعلیم، بزنس، فیشن، موسیقی، میگزین، مقالات اور بے شمار چیزیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ طالب علم حضرات مطالعے کے لئے بھی اس کا استعمال کر سکتے ہیں۔ کچھ طالب علم اپنے نوٹس اور اسائنمنٹس شیئر کرتے ہیں جو دوسرے بچوں کے کام آتے ہیں اس طرح فیس بک تعلیمی انقلاب کی شکل میں موجود ہے۔ گذشتہ ۱۰ سالوں میں اس کا استعمال کافی تیزی سے ہوتا رہا ہے اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا اہم حصہ ہے۔ ہر ایک چیز کے کچھ فائدہ اور نقصان بھی ہیں اس کا غلط استعمال بھی ہوجاتا ہے اس کے ذریعہ کئی طرح کے پروپگنڈہ بھی کافی تیزی سے پھیلتے ہیں اور سماج میں فرقہ وارانہ فسادات کا سبب بن جاتے ہیں۔ لوگ غلط پوسٹ بھی لگاتے ہیں، نقلی اکاؤنٹس بنا کر کچھ لوگ دوسروں کو بلیک میل بھی کرتے ہیں۔ بچے صرف اور صرف اپنی تعلیم سے متعلق مواد میں ان سائٹ سے کرنا چاہئے اور دوسری غلط چیزوں پر اپنا دھیان نہیں دینا چاہئے تاکہ یہ ہمارے زندگی کے لئے مفید بن سکیں۔

گرمی کی چھٹی اور بچے": اس میں مصنف نے نصیحت آموز باتوں کو رقم کیا ہے جیسا کہ ''گرمی کی چھٹی اور بچے'' عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کو اپنی گرمی کی چھٹی کس طرح گذارنی چاہئے۔ مصنف نے جب بچوں سے بات کی کہ وہ گرمی کی چھٹی کس طرح گذارتے ہیں تو بچوں نے ان کو اپنی چھٹی کے اوقات گذارنے کا طریقہ بتایا کہ وہ ایک ہفتہ میں اپنے سارے ہوم ورک کو جلد پورا کر لیتے ہیں اور اپنی چھٹی کے سارے دن رات کو یونہی بغیر کتاب کا مطالعہ کئے ہی گذار دیتے ہیں۔ اس طرح وقت گذاری سے کتاب کی محبت ان کے دل سے نکل جاتی ہے۔ اس طرح کے مشاغل کا

وہ استعمال کرتے ہیں یہ ان کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اگر ابتدائی دنوں میں اپنا ہوم ورک مکمل کرنے کے بجائے روزانہ یہ سلسلہ جاری رکھیں تو وہ جو ہوم ورک ہوگا وہ ذہن نشیں رہے گا اور یہ ان کے لیے کارآمد ہوگا، ہر کام کو پایہ تکمیل تک لے جانے لئے عقل اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے اور کام میں زیادہ سے زیادہ نکھار پیدا ہو اس کے لئے محنت ضروری ہے اور یہ محنت کبھی برباد نہیں ہوتی۔

"کتابوں کو اپنا دوست بنائیں": کتابوں سے لگاؤ پر بھی انہوں نے ایک مضمون رقم کیا ہے۔ کتاب کے لفظی معنی ہیں لکھی ہوئی چیز۔ کتاب نے ہر کسی کو بڑا آدمی بنایا ہے۔ ان لوگوں نے کتابوں کو اپنا بہترین دوست بنایا ہے۔ کتاب چاہے کسی بھی فن کی ہو جیسے تاریخی ہو، سیاسی ہو، اخلاقی ہو، منطق کی ہو یا فلسفہ کی ہو یا پھر معلوماتی ہو۔ ہر وقت ہمارے ساتھ اور معاون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ہم کتابوں کی عزت کریں گے تو ہمارا مستقبل روشن ہوگا۔ دنیا میں ہر جگہ کتب خانہ موجود ہیں جن میں ابھی کافی تعداد میں نادر کتابیں موجود ہیں۔ ہر شہر میں لائبریریاں مل جاتی ہیں جہاں کتابوں کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ جہاں ہم کتابیں مذہبی، تمدنی، تاریخی، نفسیاتی اور عام معلوماتی موضوعات پر لکھی ہوتی ہیں ان کے پڑھنے سے ہم زندگی کے مختلف عنوانات سے واقف ہوتے اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں ہمارے دلوں کو مضبوطی فراہم کرتی ہے۔ اس کے مطالعہ کے ساتھ ہم زمانہ کے ساتھ چلنے میں مدد ملتی ہے۔ کتابوں کے مطالعے سے کردار اور اخلاق کی اصلاح میں ہماری مدد کرتی ہے۔ یہ ہمیں علمی، مذہبی اور ادبی معلومات میں اضافہ کرتی ہیں اس کی رہ نمائی سے ہم زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ ایک بہترین ساتھی کی طرح ہمارے ساتھ رہا کرتی ہے کوئی بھی حالت میں ہمیں دھوکہ نہیں دیتی بلکہ ہر حالت میں ہماری رہبری کرتی نظر آتی ہے۔ اس لیے بچوں کو چاہئے کہ وہ اپنا بہترین دوست کتابوں کو بنائیں تاکہ وہ زندگی میں اچھا انسان بن کر کامیاب ہو سکے۔

کتاب کے مصنف ڈاکٹر احسان عالم نے بچوں کے ذہن پر ٹیلی ویژن کے اثرات پر بھی لکھا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ بچوں کے زیادہ ٹیلی ویژن دیکھنے سے ان کی ذہنی نشو ونما صحیح طریقے سے نہیں ہو پاتی ہے۔ اس میں دکھائے گئے پروگرام کو بچے جلد اپنی ذاتی زندگی میں آزماتے ہیں جو اکثر غلط ہوتا ہے۔ اس کے ذمہ دار والدین ہیں۔ والدین کو چاہئے کہ بچوں کے ساتھ کچھ اچھے پروگرام دیکھیں تاکہ بچوں پر ان کا اچھا اثر ہو۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو ٹیلی ویژن کا استعمال فائدہ مند ثابت ہوگا۔ ورنہ نقصان ہوگا۔ بچے فطری طور پر ہر چیز حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر انہیں وہ چیزیں نہیں ملتی ہیں تو اس میں غصہ، افسوس یا بے چینی پیدا ہونے لگتی ہے۔ ایسے حالات میں والدین کو چاہئے کہ وہ بچوں کے جذبات کے اظہار کے مثبت طریقہ سکھائیں، انہیں صبر کرنے، کوشش اور قربانی دینے کی تلقین کریں۔ نصیحت آموز کہانی سنائیں، کتاب اور رسالہ پڑھنے کو دیں، بچے کے ساتھ والدین کو بھی محنت کرنے کی ضرورت ہے والدین کو چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کی دلچسپی سے باخبر ہو کر انہیں غیر اخلاقی اور تشدد آمیز پروگرام دیکھنے سے روکیں، ٹیلی ویژن دیکھنے کا ایک وقت متعین کرلیں۔ انہیں سیر و تفریح کرائیں اور معلوماتی کتابیں اور کہانیاں پڑھنے کی، اخبار جریدہ وغیرہ پڑھنے کی عادت ڈالیں، جس سے بچوں کی ذہنی نشو ونما ہو سکے اور وہ کامیاب انسان کی طرح زندگی گزاریں۔

آگے انہوں نے اسکول اور بچے کے نام سے، کمپیوٹر کا صحیح استعمال، بچوں کے ذہن پر کارٹون کے اثرات، مادری زبان اردو تعلیم کا ذریعہ، امتحان اور بچوں کا رشتہ، بچوں پر کتابوں کا بوجھ ایک مسئلہ، کتب بینی بچوں کی رغبت، بچے اور یوم اساتذہ پر بھی کارآمد مضامین تحریر کیا ہے جن کو پڑھ کر بچوں کے لئے مفید اور کارآمد باتیں سامنے آتی ہیں۔ اگر ان تمام پر بچے عمل پیرا ہو جائیں تو ان کی زندگی میں انقلاب آجائے گا۔ مصنف نے بڑی محنت سے بچوں کو انقلابی بنانے کی کوشش ان مضامین کے ذریعہ کی ہے۔

تیسرے اور آخری حصے میں مصنف نے چند اہم شخصیتوں جن کے کارنامے بچوں کے لیے رہنمائی کا باعث ہیں ان میں پانچ اہم شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلے گاندھی جی کا ذکر کیا گیا ہے اور انہوں نے علم کے متعلق کہا ہے کہ تعلیم وہ علم اور فن ہے جس کے ذریعہ بچے کی نشو ونما اور قوم کی ضروریات کے مابین ایک رابطہ پیدا کیا جاسکتا ہے اور ملک کے نوجوانوں کو اس کے جسم کا ایک عضو بنایا جاسکتا ہے۔ گاندھی جی مہنگی فیس، یونی فارم خرچ اور کتابوں کے بے جا بوجھ کے خلاف تھے۔ اس میں ان کا خیال تھا کہ ایسے ماحول میں غریب بچے تعلیم سے دور ہوتے جائیں

گے۔انہیں ہندوستان کی بڑی آبادی کا خیال تھا جو دیہاتوں میں زندگی گزارتے ہیں۔وہ لوگ پسماندہ اور غریب ہوتے ہیں اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے ہر گاؤں میں اور ہر حصہ میں اسکول کھولا جائے تا کہ اس سے غریب پرور بچوں کو فائدہ ملے اور اسکولی تعلیم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرسکیں وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جب تک تعلیم عام نہ ہوگی بے روزگاری کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔

دوسری اہم شخصیت کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کے بچپن کا ذکر کیا گیا ہے۔ان کی پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوئی تھی۔ ان کی زندگی بھی بچپن کے ایام سے گذری مگر ایسی نہیں جو عام بچوں کی ہوا کرتی ہے۔ وہ بچپن سے الگ انداز اختیار کر کے زندگی کو کامیاب بنایا وہ اکثر پڑھنے کے لیے اپنے رفیق کو لے کر جنگل میں جایا کرتے اور درختوں کے اوپر بیٹھ کر پڑھتے تھے اور ان کے ساتھی بچے پہرا دیا کرتے تھے۔وہ بچپن سے ہی اپنے بہنوں کے ساتھ خود کو بڑے ہونے کا کردار بن کر دکھایا کرتے تھے تا کہ وہ ایسا بن سکیں۔وہی ہوا بھی اور ان کی یہ کوشش کامیابی میں تبدیل ہوئی اور ہندوستان کے عظیم عالم دین، صحافی، مکتوب نگار اور انشائیہ پرداز، تاریخ نویس کے ایسے آدمی بنے جن کی مثال آج تک ساری دنیا میں کوئی دوسری نہیں۔ بچوں کو چاہئے کہ اگر ان کو بھی اپنی زندگی میں کچھ بہترین بننا ہے تو ان عظیم لوگوں کے کارنامہ کو پڑھتے رہے تا کہ ان کی زندگی بہتر بنے۔

تیسرا مضمون چاچا نہرو پر رقم کیا گیا ہے ۔ جواہر لال نہرو کو کامیاب بنانے کے لئے بچپن سے ہی کافی جدوجہد کی گئی تھی اور وہ خود) بھی محنتی تھے اس لیے کامیابی ان کے قدم چومنے لگی۔تھوڑے پریشان وہ ضرور ہوئے مگر انہوں نے زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے بیرونِ ملک بھی گئے اور وہاں کی زبان سیکھی ،تعلیم حاصل کی، پھر نہ جانے کن کن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تب وہ ایک کامیاب انسان بن سکے۔

چوتھی اہم شخصیت ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں۔ جو ایک مثالی استاد کے نام سے جانے جاتے ہیں۔طلبہ اور اساتذہ، تعلیم کے دو اہم اور بنیادی عناصر ہیں۔ ان میں سے ایک سیکھنے والا ہوتا اور ایک سکھانے والا۔تعلیم کا سارا نظام انہیں دونوں عناصر کے اردگرد چلتا رہتا ہے۔ان دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اچھے استاد کے لئے ضروری ہے کہ طلبہ کے سامنے خود کو ایک ماڈل بنا کر پیش کریں۔ایسا کام ذاکر حسین نے کیا اور انہوں نے فرمایا کہ جس طرح چراغ سے چراغ جلائے جاتے ہیں اس طرح علم سے علم کو پھیلایا جانا چاہئے۔ ذاکر حسین کی شفقت بحیثیت استاد مشعل راہ ہے ان کی زندگی کا ہر لمحہ اپنے ملک وقوم کی خدمت میں گذرا۔ان کے نام کئی ٹریننگ کالج ہیں جن میں آج تک استاد بننے کی مہارت حاصل کرائی جاتی ہے۔ایسی عظیم شخصیت پر ہم سب کو فخر ہے۔

پانچویں اور آخری شخصیت ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی ہے۔ یہ ہندوستان کا ایک نمایاں نام ہے۔ ان کا بچپن اخبار و رسائل فروخت کرنے میں گذرا ۔ سائنس میں گریجویشن کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدراس کے انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (ایم آئی ٹی سے ایروناٹیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما کیا ۔ ۱۹۵۸ء میں ڈی ٹی ٹی ڈی اینڈ پی میں بطور سینئر سائنسٹسٹ مقرر ہوئے ۔ اس سال ڈفینس ریسرچ سنٹر ڈی آر ڈی او میں سینئر معاون سائنس داں کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ان کی نگرانی میں سائنس دانوں کی ٹیم نے Prototype Hovercraft کو بلندی پر پہنچایا۔آپ نے ناگ، پرتھوی، ترشول اور اگنی جیسے مزائیلوں کا کامیاب تجربہ کیا۔ ان کے کارناموں کے لئے دنیا خاص کر ہندوستان انہیں لمبے عرصے تک یاد رکھے گا۔ ۲۵/ جولائی ۲۰۰۲ کو اے پی جے عبدالکلام کو ہندوستان کا صدر جمہوریہ بنایا گیا۔ ان کی گیارہ کتابیں ہیں۔دو کتابیں کافی مقبول ہوئی (۲(۱ Wings of fire(India(2020۔ یہ بچوں کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوں گی۔ ان کو ۳۰ یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی تھی۔ سائنس کی دنیا میں اس عظیم انسان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔آج بھی اگر ہمارے بچے ان کی زندگی کا مطالعہ کریں تو یقیناوہ ایک کامیاب شہری ، ایک اچھا انسان اور اچھا سائنس داں بن سکتے ہیں۔

ڈاکٹر احسان عالم نے بڑی جانفشانی کے ساتھ اپنی اس کتاب میں تمام طرح کے مشوروں کو مضمون کی شکل میں بچوں کے سامنے پیش کر دیا ہے اور میرا یقین ہے کہ اگر بچے ان تمام موضوعات کو پڑھ کر اپنی زندگی میں ان لوگوں کے کارناموں کو بسانے کی کوشش کریں تو ان کی زندگی میں بھی انقلاب آجائے گا۔

☆☆☆

غزل

محبوب خان اصغرؔ
Mob. 9246272721

لوگ جو گہرے اندھیروں کو ضیاء کہتے ہیں
وہ بتائیں بھلا بینائی کو کیا کہتے ہیں

نغمگی وہ ہے جسے روح جنم دیتی ہے
بے سروں کو بھی یہاں نغمہ سرا کہتے ہیں

شور نعروں کا صداؤں کا لگے سمع خراش
ہم اذانوں کو مگر حسنِ صدا کہتے ہیں

جن رویوں کو دیا نام ہے تہذیبِ نوی
اہلِ اخلاص انہیں ذوقِ ریا کہتے ہیں

حرفِ قرآن کو سوچوں میں سموکر رکھیں
اسی نسخے کو دمِ قلبِ صفا کہتے ہیں

چاندنی ذوقِ نگارش کی ضیاء پاش سہی
ہم تدبر کو ہی سورج کی ضیاء کہتے ہیں

کیوں گناہوں کی دیا کرتے ہو تعبیرِ خطا
بھول دانستہ نہ ہو گر تو خطا کہتے ہیں

ہم نے ہیرے کی طرح خود کو تراشا اصغرؔ
بات ہم اپنی زمانے سے جدا کہتے ہیں

☆☆☆

غزل

مرغوب اثرؔ فاطمی
Mob. 9431448749

شعارِ خود ستائی میں پشیمانی کا کیا ہوگا
دیانت پوچھتی ہے آنکھ کے پانی کا کیا ہوگا

جو پروازِ تخیل سے بھی بالاتر کہیں پر ہے
وہی چھم سے اُتر آئے تو حیرانی کا کیا ہوگا

کیے جاتا ہے گلّہ بان ہر دن میمنے غائب
بھروسا اُٹھ گیا جس دم نگہبانی کا کیا ہوگا

شکستہ ہوتی جاتی ہے سماعت کی ہُنرمندی
تو پھر خوش رنگ نغموں کی فراوانی کا کیا ہوگا

دھواں سا دیکھتا ہوں چار سو شہر نگاراں میں
نمائش میں رکھے چہروں کی تابانی کا کیا ہوگا

عجب ہے، پاؤں میں اُمّ الشفق کے موچ آئی ہے
نہ چھٹکی چاندنی تو شب کی ویرانی کا کیا ہوگا

کبھی سوچا ہے دنیا کو نچاتی عقل مندی نے
تغافل جھیلتی مجبور نادانی کا کیا ہوگا

سرایت بستیوں میں کر گئے کردار صحرا کے
پریشاں ہوں کہ پھر ذوقِ بیابانی کا کیا ہوگا

اثرؔ آنچ آگئی گر حرف و معنی کی نفاست پر
بکھر جائے گا شیرازہ، سُخن دانی کا کیا ہوگا

☆☆☆

غزل

اصغر شمیم
MOB- 9836224948

یہ زمیں آسمان ہے مجھ میں
کیا کہوں اک جہان ہے مجھ میں

ہر کسی کو پناہ دیتا ہوں
اک کشادہ مکان ہے مجھ میں

چاند تارے بھی توڑ لاؤں گا
آج اتنی اڑان ہے مجھ میں

لفظ میں ہے مٹھاس کچھ ایسی
کوئی شیریں زبان ہے مجھ میں

میرے چہرے کو پڑھ رہا ہے وہ
اس کا سارا س دھیان ہے مجھ میں

میری پرواز کی نہ حد پوچھو
اک خلائی اڑان ہے مجھ میں

مجھکو اصغرؔ وہ پڑھنا چاہیں ہیں
اک نئی داستان ہے مجھ میں

☆☆☆

غزل

ایم۔ایچ تابش ردولوی
Mob. 9580228003

ترے خیال کا جو اشتراک ہو جائے
جہانِ شعر میں اپنی بھی دھاک ہوجائے

نیاز و راز کے پردے تو اٹھ ہی جائیں گے
نگہ کا دل سے ذرا انسلاک ہو جائے

پھر اُس کے بعد کا رستہ تو وہ نکالے گا
خودی سے نفس کا کچھ انہماک ہو جائے

فلک جو اپنی تمازت پہ ناز کرتا ہے
زمیں کے کرب سے الجھے تو خاک ہو جائے

دعا حصولِ اثر کے لیے نکلتی ہے
فلک کا آج گریباں نہ چاک ہو جائے

سخن تو وہ ہے کہ نازاں ہو جس پہ حرفِ سخن
زبان وہ، جو زبانوں کی ناک ہو جائے

سخن کے سارے فلک روندتا پھرے تابش
جو طبعِ میر کا کچھ اشتراک ہو جائے

☆☆☆

غزل

ذکی طارق بارہ بنکوی
Mob. 7007368108

اجالا ، خوشبو ، ہوا ، آب ، تازگی لاؤ
حیات بخش عناصر کی یہ لڑی لاؤ

تعلقات نے بےحس بنا دیا ہے مجھے
مری حیات میں اب کربِ بیکسی لاؤ

مبارک آپ کو فردوسِ ہمنشینی مگر
مجھے بھی یادوں میں اپنی کبھی کبھی لاؤ

تمام وسعتِ کونین ہو بسی جس میں
خیال و فکر میں ایسی کشادگی لاؤ

تمہارے وصل کی لذت میں کیف باقی نہیں
وہی فراق کے موسم کی بے کلی لاؤ

یہ دریا اور سمندر ہمیں نہیں درکار
ہمارے واسطے پندارِ تشنگی لاؤ

تمہاری ذات میں پھر چار چاند لگ جائیں
اگر سلوک میں اپنے خلوص بھی لاؤ

کوئی تو زندگی جینے کا چاہئے مقصد
اگر سکوں نہیں ملتا تو درد ہی لاؤ

تمہیں ہے مرنا تو پھر اس طرح مرو اے "ذکی"
کہ اپنی موت میں آثارِ زندگی لاؤ

☆☆☆

سانیٹ

ڈاکٹر رؤف خیر
9440945645

کس سے انصاف طلب ہو مری بوڑھی مائی
تم نے کیا سوچ کے بلوانوں سے ٹکر لی ہے
تم نے کیا سوچ کے ایوانوں سے ٹکر لی ہے
تم سمجھ دار ہی کب ہو مری بوڑھی مائی

ہاں سمجھ دار تو شوہر بھی تمھارے نہ لگے
دوست دشمن کی وہ پہچان نہیں رکھتے تھے
حوصلہ رکھتے تھے سامان نہیں رکھتے تھے
اس لیے اُن کے سفینے جو کنارے نہ لگے

اپنی ہی جان بچانے کے پڑے تھے لالے
پھر بھی کم زوروں کی وہ جان بچانے نکلے
اور مایوسوں کا ایمان بچانے نکلے
پائے اُمید میں ہر چند پڑے تھے چھالے

کھٹکھٹاتے ہوئے دروازے گزارا تم نے
کیا مدد گارِ حقیقی کو پکارا تم نے ؟

☆☆☆

نظمیں

پاگل

جب میں چھوٹا تھا
اک پاگل الجھے بالوں والا
اکثر آیا کرتا تھا
طرح طرح کی باتیں کرتا
آج یہ میں نے جان لیا ہے
قطرے میں دریا ہوتا ہے
ذرے میں صحرا
لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں

خواب روشن ہیں

چاندنی رقص ہوا
زرتار آب موج پتوں کی صدا
بام و در اشجار، رستوں پر تھرکتی چاندنی
پتیوں پر اس کے قدموں کے نشاں
ذہن کے موسم میں خنکی کا اثر
دل میں یادوں کی تھنکتی پائلیں
اور اندھیرے گھروں میں
خواب روشن ہیں دلوں کے درمیاں

مشورہ

سنو! تم دوست ہو میرے
تو مری بات مانو
تمھارے دانت میں الجھے ہوئے
کچھ گوشت کے ریشوں سے
بو آنے لگی ہے
انھیں تم صاف کرلو
پھر کہیں آرام سے باتیں کریں گے۔

شعیب ندیم گورکھپوری
9559736702

نیم پلیٹ

وہ عمارت
جہاں میں رہتا ہوں
جسے دنیا میرا گھر کہتی ہے
جہاں میں اپنے
افرادِ خاندان کے ساتھ
ان سب کی مرضی
ان سب کے حقوق
اور اپنے فرائض کی ادائیگی کرتے ہوئے
زندگی گزار رہا ہوں
میرے خواب میری خوشیاں
میری خواہش، میری مرضی
میرے جینے کا انداز
کچھ بھی نہیں میرا
میرا تعلق
گھر سے بس اتنا ہے
گھر کے باہر
میری نیم پلیٹ
آویزاں ہے۔

وال پیپر

وال پیپر دیکھے ہیں؟
طرح طرح کے خوشنما رنگیں
جاذب نظر
دلکش، دل نشیں
دیواروں کو خوبصورت بنائے ہوئے
عمارتوں کی زینت بڑھائے ہوئے
کبھی سوچا ہے وال پیپر کے پیچھے کی دیواریں
جو کسی کو نظر نہیں آتیں
بوسیدہ نما، کھردری، بدرنگ، ناہموار
جیسے ہماری چہروں کی مسکراہٹیں
رونقیں، قہقہے، چمک، دمک
سب کا سب
وال پیپر ہیں۔

پرویز ادیب کانپوری
9935845335

قطعات

مصداق اعظمی

Mob. 9451431700

تو اپنے چاہنے والوں میں یارب
مرے دل کے نشاں تسلیم کر لے
تری یادوں کا شب بے دار ہوں میں
مری آہ و فغاں تسلیم کر لے

****

میرے بارے میں اس کے کانوں میں
جانے کیا کیا سنائی دیتا ہے
ایک شاعر کو چھوڑ کر مجھ میں
اس کو سب کچھ دکھائی دیتا ہے

****

اپنے دکھ درد کی کہانی سے
ذہن جس کا یہاں الجھتا ہے
شعر کہنے کا ہے وہی حقدار
میر کی "سی" کو جو سمجھتا ہے

****

بہت سے قیمتی الفاظ میں تھی زندگی لیکن
غلط ماحول میں بے موت مرنے سے نہیں چوکے
جہاں سو بات پر اک بات کرنے کی ضرورت تھی
وہاں بھی ہم ہزاروں بات کرنے سے نہیں چوکے

****

بعد مرنے کے ملی گی آپ کو جنت مگر !
لطفِ جنت اس جہاں میں شیخ جی حاصل کریں!!
مشورہ ہے وادیِ کشمیر کے ہوتے ہوئے!!
جیتے جی جنت میں جانے کی خوشی حاصل کریں!!

****

اتنی خوددار طبیعت کے ہیں مالک پھر بھی !
جوش میں ہوں بھی تو بے ہوش نہیں ہو سکتے !!
سچ ہے اک محسنِ کم ظرف کے بارے میں کبھی!
ہم تو احسان فراموش نہیں ہو سکتے !

****

ہمارے پاؤں کے نیچے پڑے پڑے اکثر !
ہماری منزلِ مقصود سونے لگتی تھی !!
عجیب دن تھے وہ مصروفیت کے دن مصداق!
ہمیں جہاز سے بھی دیر ہونے لگتی تھی !!

****

بدلتی جا رہی ہے ہر روایت !
جنھیں جینا تھا وہ بھی مر رہے ہیں !!
مرے احباب میرے فیسبک پر
مرے مرنے کو لائیک کر رہے ہیں

****

راہِ ہموار ہو گئی دشوار
ایک ہی پل میں اک صدی رکھ دی
پل بنانے کے واسطے صاحب
آپ نے بیچ میں ندی رکھ دی

****

حیراں ہیں دل وجاں سے وہ اس دور میں ہم پر
بے لوث محبت کو لٹانے کے لئے تھا
رشتہ تو ہمارا بھی نہیں تھا کوئی اس سے
جو شخص ہمیں رونے رلانے کے لئے تھا

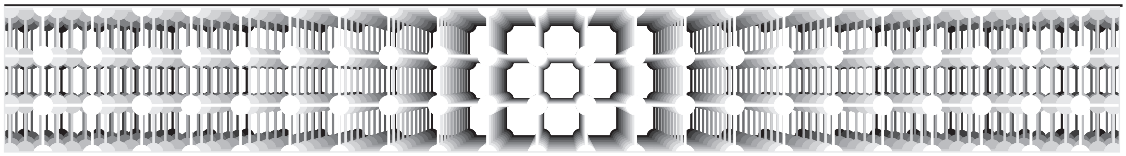
****

ایک سے اک ہزار خائف تھے
حق و باطل کے اس شمارے میں
کربلا ڈھونڈتی ہے یہ دنیا
اب بہتر کے اشتعارے میں

****

اپنے ان ہاتھوں کے چھالوں سے ہوں بالکل مطمئن
دل سے خودداری کا رستہ صرف چھوڑا ہی نہیں
کاسہِ محنت میں اجرت کی جگہ جو بھیک دے
ایسے کم ظرفوں سے رشتہ میں نے جوڑا ہی نہیں

****



افسانہ

بہروپئے

اشتیاق سعید

بالاجی چوک، میرا روڈ، تھانے (ممبئی)۔401107، Mob. 9224799971

سارا گجرات سُلگ رہا تھا۔ گولیوں کی دھائیں دھائیں کلیجہ دہلائے دے رہی تھیں انتظامیہ تو انتظامیہ قانون کے محافظ تک 'رام' کے نام پر لوٹ مار، قتل و غارت گری میں ملوث تھے۔ عصمتوں کو داغدار کر رہے تھے، معصوم سینوں میں خنجر اُتار رہے تھے، ضعیف العمر اور اپاہجوں کو آگ میں نہلا رہے تھے۔ ہر سُو آہوں، کراہوں اور چیخوں کا راج تھا۔ غرضیکہ بربریت اپنے پورے شباب پر تھی۔

شباب تو سیتا پر بھی کچھ ایسے ہی ٹوٹ کر آیا تھا کہ رہ رہ کر اُسکا آنچل ڈھلکنے لگا تھا اور اُس کا باپ اُسکے بیاہ کے تعلق سے فکر مند رہنے لگا تھا۔ سیتا کا بوڑھا باپ کوئی راجہ جنک تو تھا نہیں کہ اُس کے لیے سوئمبر رچاتا۔ اگرچہ سیتا تھی انتہائی حسین۔۔۔ اُس کے حُسن کا ڈنکا سارے بھڑوچ میں بجتا تھا مگر افسوس! کسی میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ رام بن کر اُسکی زندگی سے جُڑ جاتا۔ کیونکہ اُس کے حُسن کے چاند کے مقابلے وقار کا سورج مفلسی سے قدرے گہنایا ہوا تھا دوسرے اُس کا باپ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی لاڈلی کسی غریب کے پلّے سے بندھے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مفلسی آدمی کا وقار کھو دیتی ہے اور اُسکی انا، اُسکی آبرو، اُسکے سوا بھیمان کو بھرپور تحفّظ فراہم نہیں کر سکتی۔۔۔ مفلسی ہمارے معاشرے کا ایک ایسا مرض ہے جو آدمی کے وقار کے ساتھ ساتھ اُس کی مردانگی تک نچوڑ لیتی ہے۔ طاقتور سے طاقتور مرد کو ذہنی اور قلبی طور پر مفلوج کر دیتی ہے۔

باپ غریب ضرور تھا مگر تھا دور اندیش۔۔۔ اُس نے سوچا یہاں اس شہر میں بیٹی کا حُسن اُسکی مفلسی کی زد میں ہے کیوں نہ ہم کسی دوسرے شہر کوچ کر جائیں۔۔۔ کسی ایسے شہر جہاں اُسکا بے مثال حُسن کسی کو اُس کی کم مائیگی کے متعلق سوچنے کا موقع ہی نہ دے اور وہ من ہی من اپنی لاڈلی بیٹی سیتا کی خاطر رام کی تلاش میں نکلنے کے لیے شہر کا انتخاب کرنے لگا۔۔۔ یکے بعد دِگرے کئی شہروں کے نام اُس کے ذہن کے مانیٹر پر نقش ہوئے لیکن اُن تمام ناموں میں سے کوئی نام اُسے لُبھا نہ سکا۔ اُس کی سوچ تھی کہ شہر کا نام بھی رام کی شخصیت کے ہم پلّہ ہونا چاہئے اور اُس کے ذہن میں رام کے نام سے منسوب شہروں اور قصبوں کی فہرست مرتب ہونے لگی، جیسے رام گنج، رام نگر، رام پور، رام گڑھ، رام سرائے ! مگر افسوس! اِن تمام ناموں میں اُسے کوئی خاص جاذبیت محسوس نہ ہوئی اور وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر فکر و تردّد کی دبیز چادر اوڑھ کر لیٹ رہا۔ اچانک اُسے شور و غوغا سا کچھ سُنائی پڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور شور کو اپنی سماعت میں جذب کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ باوجود اس کے اُسے جب کچھ صاف سُنائی نہ دیا تو وہ جھنجھلا کر باہر سڑک پر نکل آیا۔ وہاں اُسے دور سے ایک جلوس آتا دکھائی دیا جو غالباً سو ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل رہا ہوگا۔ چند ایک نے ہاتھوں میں بھگوا جھنڈا اُٹھا رکھا تھا تو کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں ترشول تھا۔ وہ سب کے سب ہم آواز ہو کر متواتر بس ایک ہی نعرہ لگائے جاتے تھے کہ ''قسم رام کی کھاتے ہیں مندر وہیں بنائیں گے''۔ رام کا نام سُنتے ہی اُس کے دِل میں سیتا کی خاطر رام کی چاہ اضطراری کیفیت اختیار کر گئی۔۔۔ کون ہے رام؟ کہاں ہے رام؟ کوئی مِلوائے مجھے بھی رام سے۔۔۔ میری بیٹی سیتا اُسے جے مالا پہنانے کو بیکل ہے۔

پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ جلوس کارسیوکوں کا ہے اور یہ سارے لوگ اجودھیا جانے والے ہیں شیلا دان کرنے کے لیے۔۔ ابھی شیلا دان کریں گے پھر رام مندر کا نرمان کریں گے۔

'کیا! رام مندر کا نِرمان!'' وہ چونک پڑا تھا۔ ''اجودھیا میں رام مندر کا نِرمان؟''۔

بتانے والے نے کہا۔ ''ہاں بھائی اجودھیا ہی میں تو رام جنم بھومی ہے''۔

''رام جنم بھومی !'' وہ حیرت سے بتانے والے کا چہرہ تکنے لگا۔

''ہاں! اجودھیا ہی میں بھگوان رام چندر کا جنم ہوا تھا ناں ؟''۔

''ہاں! ہاں ہاں !! اجودھیا ہی میں بھگوان رام کا جنم ہوا تھا''۔ وہ مارے خوشی کے چہکنے لگا تھا۔

''لیکن بھائی اب بھی تو وہاں کسی نہ کسی رام کا جنم ہوتا ہوگا ؟''۔

''جنم کی کہتے ہو۔۔۔ وہاں تو جنم جنمانتر سے بس رام ہی رام ہیں، کن کن میں رام۔۔۔ جل میں رام، وایو میں رام، رام نام ستیہ ہے''۔ اور بتانے والا لپک کر جلوس میں شامل ہو گیا تھا۔۔۔ سیتا کا بوڑھا باپ بے حد خوش تھا اور قدرے مطمئن بھی کہ اب کوئی نہ کوئی رام اس کی بیٹی کو ضرور جُڑ جائے گا کیونکہ وہ اپنی لاڈلی سیتا کو لیکر رام جنم بھومی جائے گا، وہ بھی کارسیوک بن کر۔۔۔ وہاں شیلا دان کے ساتھ ساتھ کنیا دان کا بھی پُن پراپت کرے گا۔

کارسیوکوں میں ہر قبیل کے لوگ شامل تھے ۔شریف النفس بھی، لُچّے لفنگے بھی، دھرمی ادھرمی بھی۔۔ سبھی سیتا کو للچائی اور پیاسی نِگاہوں سے تکتے تھے۔ چند ایک نے تو فقرے بھی کسے تھے ، ایک سادھو نُما کارسیوک کی آنکھیں اُسے دیکھتے ہی ہوسناک ہو گئیں اور وہ شُدہ شُدہ اپنا آپا کھوتا گیا تھا۔ اُس کی اس حرکت پر بوڑھا باپ برہم ہو گیا۔ لیکن وہ سادھو نُما کارسیوک بجائے پشیمان ہونے کے بوڑھے کا گریبان پکڑ لیا۔ پھر کیا تھا اُس کے گُرگے قہقہہ لگاتے ہوئے ادبدا کر سیتا سے بدتمیزی پر اُتر آئے ۔ یہ منظر دیکھکر بوڑھا باپ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا، بیٹی کی آبرو کی دُہائی دینے لگا لیکن وہاں ایسا کون تھا جو اُن دُشٹوں سے اس ابلا کو بچا لیتا۔ یوں تو مرد بہت سے تھے لیکن سبھوں کی مردانگی محض مونچھوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

بوڑھا باپ متواتر دہائی دیتے دیتے تھک چُکا تھا اور گاڑی اپنی پوری رفتار سے اجودھیا کی سمت رواں دواں تھی۔ ہر لمحہ اجودھیا کا فاصلہ کم سے کم تر ہوتا جا رہا تھا جبکہ بوڑھا باپ سوچنے پر مجبور تھا کہ وہ اجودھیا جا رہے ہیں یا لنکا؟ چونکہ کارسیوک اُسے رام بھکتوں کے روپ میں راون بھکت معلوم ہو رہے تھے یعنی کہ راکشش!۔

اس دوران ایک کارسیوک سیتا کے ساتھ دست درازی کر بیٹھا اور اسی آن نہ جانے کہاں سے ایک نوجوان رام چرن وہاں آدھمکا اور جھپٹ کر اُس کارسیوک پر لاتوں گھونسوں کی برسات کر دی جو کوئی بھی اُس کے بیچ بچاؤ کو آتا وہ اُس پر بھی ٹوٹ پڑتا۔ نتیجتاً سارے کے سارے دم سادھ لیے اور اُس سادھو نُما کارسیوک کا تو کہیں اتہ پتہ ہی نہ تھا۔

اجودھیا پہنچنے پر دونوں باپ بیٹی نوجوان رام چرن کے ساتھ ہی ساتھ رہے ۔ بوڑھا باپ اُسے ہر گھڑی ممنونیت سے تکتا اور دِل ہی دِل اُس کی بہادری اور شجاعت کے قصیدے پڑھتا رہتا۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کے ذہن میں یہ سوال مکھی کی مانند بھنبھنانے لگا تھا کہ کہیں رام چرن ہی اُسکی بیٹی سیتا کا حقیقی رام تو نہیں؟ اور اُسے رام چرن ہر لحاظ سے سیتا کے لیے موزوں و مناسب لگنے لگا۔ پھر من ہی من اُس نے فیصلہ کر لیا کہ جس مہورت میں شیلا دان ہونے کو ہے اسی مہورت میں وہ رام چرن کے سنگ سیتا کا گٹھ بندھن کر کنیا دان کر دیگا اور وہ اس تعلق سے رام چرن کی رائے جاننے کے لیے اُس کے کمرے کی جانب چل پڑا۔

جس دھرم شالہ میں دونوں باپ بیٹی ٹھہرے ہوئے تھے اُسی کی اوپری منزل کے ایک کمرے میں رام چرن بھی قیام پذیر تھا۔ بوڑھا جب اُس کے کمرے پر پہنچا تو کواڑ بھڑے ہوئے تھے شاید رام چرن سو رہا ہو یہ سوچ کر وہ پلٹنے ہی کو تھا کہ اندر کچھ گرنے کی آواز گونجی۔ وہ ٹھٹھک گیا اور ادھ کھلی کھڑکی کے پٹ سے اندر جھانکا۔ رام چرن دھوتی باندھے آئینہ کے روبرو کھڑا اپنے سراپا کا جائزہ لے رہا تھا گو اُس کی پُشت کھڑکی کی جانب تھی ۔ چند لمحات وہ یوں ہی کھڑا ہر دو زاویوں سے خود کو نہارتا رہا پھر قدرے تامل کے بعد کھونٹی سے ٹنگا کُرتا اُتار کر زیب تن کیا اور اسی کھونٹی سے آویزاں سفری تھیلے کی زِپ کھول کر لمبے بالوں اور داڑھی کی وِگ (wig) نِکالی پھر بڑے ہی احتیاط سے بالوں کو دُرست کر کے سر پہ اوڑھ لیا۔ اُلجھی ہوئی داڑھی سُلجھائی اور چہرے پر منڈھ لی اور ماتھے پر چندن کا تِلک لگا کر جوں ہی پلٹا بوڑھے کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ وہ اب رام چرن نہیں بلکہ سادھو نُما کارسیوک تھا۔۔۔ وہ کمرے سے جوں ہی باہر آیا بوڑھے نے لپک کر اُس کی داڑھی نوچ لی اور غرّایا۔ ''دُشٹ بہروپیے''۔

اس سے قبل بوڑھا کوئی ٹنٹا کھڑا کرتا رام چرن نے اُس کے سر پر ایک ضرب لگائی وہ تیورا کر اُس کے قدموں میں آرہا اور ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔ رام چرن فوراً اُسے کھینچ کر کمرے میں لے آیا۔ جھٹ پٹ بالوں کی وِگ اُتاری، داڑھی بوڑھے کے ہاتھ سے کھینچ کر جلدی جلدی اپنے کپڑے، چادر و دیگر اشیاء تھیلے میں ٹھونسا اور تھیلا اُٹھا کر کمرے سے نِکل گیا۔ بوڑھے کا ہوش جب بحال ہوا وہ آنکھیں مچکا مچکا کے اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا اسی آن اُسے اچانک اپنی بیٹی سیتا کا خیال آیا اور وہ فوراً اُٹھ کر کمرے سے باہر نِکل آیا۔ لپک جھپک زینے سے نیچے اُترا۔ کسی طرح اپنے کمرے تک پہنچا۔ دروازے پر تالا دیکھ کر چونک پڑا۔ اسی ثانیہ دھرم شالہ کا ایک کارندہ بوڑھے کو دیکھ کر یوں ٹھٹھکا گویا اُسکے قدموں کو کاٹھ مار گیا ہو۔ ''ارے مہاشئے آپ!۔۔ آپ کا تو ایکسیڈنٹ ہوا تھا؟ آپ ہسپتال میں تھے؟'' ۔

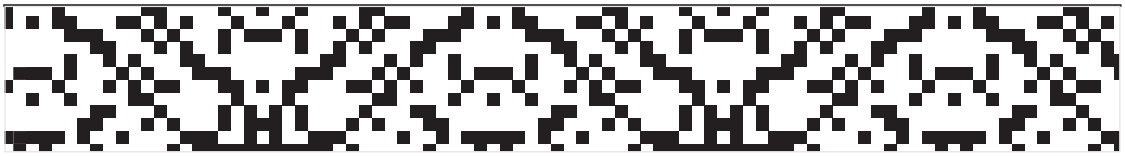
بوڑھا کھِسیا کر چیخ اُٹھا۔ ''میرا کیوں ایکسیڈنٹ ہونے لگا ؟ میں کیوں جاؤں اسپتال میں؟؟''۔

''اسی کارن تو اس سمئے میری استھتی وِسمے جنک ہے کیونکہ آپ اچھے بھلے ہیں۔۔ آپ کے تو کہیں کھروچ تک نہیں آئی ہے۔۔ پرنتو آپ کی پُتری رام چرن کے ساتھ آپ کو دیکھنے ہسپتال گئی ہے''۔

''کیا سیتا رام چرن کے ساتھ۔۔۔؟'' بوڑھے کا سر چکرانے لگا اور وہ وہیں دھپ سے فرش پر بیٹھ گیا۔

اُسے محسوس ہوا جیسے ایک بار پھر راون اپنی چال میں کامیاب ہو گیا ہے۔۔ پھر سیتا کا ہرن ہوا ہے۔۔۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی آتما جسم سے نِکل کر اپنے اصل میں تحلیل ہو گئی۔

☆ ☆ ☆



افسانہ

زندگی اک قوس وقزح

ذوالفقار علی بخاری۔ پاکستان

ای میل:zulfiqarali.bukhari@gmail.com

آسمان پر دور دور تک ابر چھائے ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔ابھی تھوڑی دیر قبل خوب بارش ہوئی تھی۔۔۔میں چھت پر کھڑی قوس وقزح دیکھ رہی تھی۔ میرے ذہن میں یہی بات چل رہی تھی کہ میری زندگی میں بھی اب تک بہت سے رنگ آ چکے ہیں۔۔۔ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہوئی تو میں جلدی سے نیچے کی طرف آ گئی جہاں سب اپنے جمع تھے۔۔۔۔۔ہر کوئی اپنی اپنی سنا رہا تھا مگر میں اپنی سنائی جا رہی تھی۔سب کو اعتراض تھا کہ فراز سے شادی کیوں کر رہی ہوں۔میں نے ٹھان لی تھی کہ مجھے فراز سے ہر صورت میں شادی کرنی چاہیے۔کسی کو کیا پتا تھا کہ میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں اس سے ہی شادی کروں گی۔۔۔۔۔۔میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے کبھی وعدہ نہیں توڑا تھا۔اسی وجہ سے جب میں نے فراز کو خوشیاں دینے کا سوچ لیا تھا تو پھر سب کے سامنے اس کے حق میں دلیل دینے لگ گئی تھی۔میں نے صاف صاف کہا دیا تھا کہ میں شادی کروں گی تو فراز سے ہی کروں گی۔اس میں کیا حرج ہے کہ وہ پڑھا لکھا نہیں، وہ اچھا کما سکتا ہے، اس کی کرائے کی چند دکانیں تھیں جس سے وہ مجھے بھوکا نہیں مرنے دے گا۔

میرے والدین اور بہن بھائی سب نے بالآخر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ میری شادی کی تاریخ طے کر دی۔جس روز میری سالگرہ تھی اس دن ہی ہماری منگنی ہو گئی تھی۔۔۔۔۔۔میں اس روز بہت خوشی محسوس کر رہی تھی۔

میری ایک خالہ کی وفات کے بعد دوسری خالہ نے بہت پہلے ہی کہا دیا ہوا تھا کہ وہ مجھے اپنی بہو بنا لیں گی۔اُن کی وفات کے بعد فراز کا مجھے ایک ایس ایم ایس آیا تھا جس میں اس نے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا مگر میں نے گھر والوں کی جانب سے پابندی کا کہہ دیا تھا۔اس نے اپنی والدہ یعنی خالہ والی بات دہرائی کہ امی کو بہت شوق تھا کہ تم اس گھر میں آؤ۔میں نے اپنی جانب سے کہہ دیا تھا کہ اگر میرے والدین کو پسند ہوا تو مجھے بھی تم سے شادی پر اعتراض نہیں ہوگا۔میری والدہ نے بھی بہن کی بات پر یہی کہا تھا کہ جب اس کی مرضی یہی تھی تو مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ میں اس حوالے سے کوئی رکاوٹ ڈال دوں۔۔۔۔میری بات سے آپ کو یوں لگ رہا ہوگا کہ میں بہت خوش نصیب واقع ہوئی ہوں کہ جس کی ہر بات کو مان لیا جاتا تھا، اب ایسا بھی کچھ نہیں تھا۔یہ تو قسمت کی بات تھی کہ میری کوشش سے فراز کے ساتھ بات طے ہو گئی تھی۔ورنہ شادی تو نصیب کی بات ہے جہاں لکھی ہو، ہو جاتی ہے۔اگر ایسا کچھ نہ ہوتا تو پھر میری شادی جمیل سے ضرور ہو جاتی۔جو کہ میرے ساتھ ایک اسکول میں پڑھایا کرتا تھا۔اس نے میرے بھائی کو میرے کہنے پر ٹیوشن بھی پڑھائی تھی۔بعد ازاں مجھے اسکول کے ہی چند طالب علموں کی وساطت سے معلوم ہوا تھا کہ وہ میرے لئے کیا جذبات رکھتا ہے۔جب میں نے پہلی مرتبہ موبائل فون لیا تھا تو میرے علم میں بات آئی تھی کہ میں نے محض اس سے رابطے کیلئے یہ لیا تھا مگر درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی مگر کچھ طلبہ میں یہ بات پھیل چکی تھی۔

جمیل کی پسند کو میں جان چکی تھی مگر وہ ایک آنکھ بھی مجھے نہیں بھایا تھا۔۔۔میں نے اس کو صاف انکار بھی کر دیا تھا۔

اس نے اپنی کوشش کی تھی، اس نے جب جب رشتہ گھر تک بھیجا، والدین نے صاف انکار ہی کر دیا تھا۔ میں نے شروع سے ہی والدین کی مرضی پر خود کو چلانے کے ساتھ اپنی بھی منوائی تھی تو مجھے اس انکار پر رنج نہیں تھا مگر فراز سے شادی کا فیصلہ ایک وعدے پر کر لیا تھا کہ مجھے خوشی دینی تھی۔

میں نے اُنیس سال کی عمر میں ٹیوشن بھی پڑھانا شروع کر دی تھی۔ دوسری طرف میری زندگی میں نت نئے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ ایک طرف میں جہاں اپنے شاگردوں کو اچھے سے پڑھاتی تھیں۔ وہیں دوسری طرف میری سادگی میرے لئے مسائل بھی کھڑے کر رہی تھی۔ میرے والد کے ایک دوست کا بیٹا بھی مجھے پسند کرنے لگ گیا تھا۔۔۔یہ پسندیدگی میری لاعلمی میں تھی۔

جب ایک بار میرے بات نہ کرنے پر وہ گھر رہنے آیا اور واپس چلا گیا تو اس کی بہن نے اس حوالے سے مجھے بتایا تو میں نے معذرت کر لی تھی۔

پھر میں نے بات کرنا چھوڑ دی تھی کہ میں کوئی تعلقات استوار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے ہاں سے تین مرتبہ رشتہ آیا اور گھر والے نے اس وجہ سے نہیں کیا کہ مجھے بہت دور شادی کے بعد جانا پڑتا۔ شروع میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں نے اپنی ضد پر جو شادی کی تھی، وہ اس واقعے کے کچھ عرصہ بعد ہی کر لی تھی۔ جس کے بارے میں ان کو ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔ میں اپنی زندگی کو اپنی من مانی سے جی رہی تھی۔

میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے کبھی فرمائش نہیں کی تھی۔ گھر میں مالی حالات شروع میں کافی تنگ تھے۔ بچپن میں کھیلنے کو گڑیا تک نہیں ملتی تھی۔ لباس کے حوالے سے بھی احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھی۔ والد کی جب پنشن شروع ہوئی اور ان کی ذریعہ معاش میں بہتری آئی تو گھر میں بہت آسودگی سی آ گئی تھی۔ جس کی وجہ سے پہلے بہن کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور پھر اس کو رہنے کیلئے باہر بھیجوایا۔ جس نے وہاں پر اپنی تعلیم تو حاصل کی مگر بھائی کو بھی وہاں پر بلوا لیا تھا۔

یہ میرا وہ بھائی تھا جس کی وجہ سے میں بہت کچھ سہہ لیتی تھی۔

ایک بار میں نے امی کے دیے ہوئے پیسے جو بھائی نے گم کر دیئے تھے۔ اس کی ذمہ داری خود پر لے کر مار تک خود کھائی تھی۔ اب جب بھائی باہر سے واپس آیا تو مجھے کچھ رقم بھی دی اور نم آنکھوں سے خوشی کا اظہار بھی کیا کہ بہن نے بھائی کے لئے اس قدر قربانی دی۔

اس طرح کے کئی واقعات میری زندگی کا حصہ ہیں۔ یہ سب اس لئے بتا رہی ہوں کہ کوئی پڑھے تو یہ سبق حاصل کرے کہ زندگی میں حوصلہ ہار دینا، گھبرا جانا اور مشکلات سے ڈر جانا کوئی خاص عمل نہیں ہے۔ ان سب سے نبرد آزما ہونا اور زندگی میں آگے بڑھتے جانا ہی سب سے اہم عمل ہے۔

ایک بار میں جب بھائی کے ساتھ قرآن پڑھنے گئی اور راستہ بھول گئی، کسی شخص نے ہمیں واپس گھر کے قریب چھوڑا اور ہمارے مالک مکان کو بتایا کہ بچے دور تک آ گئے تھے۔ اس پر اس نے والد صاحب کو بتا دیا تھا جس پر ہماری بہت پٹائی ہو گئی تھی۔ اگرچہ تب یوں بچوں کے ساتھ ہر اسکی کے واقعات نہیں ہوا کرتے تھے مگر پھر بھی والد صاحب کو ہماری فکر تھی۔

اسی طرح سے ایک بار انار توڑ کر لانے پر بھی خالہ نے ہمیں کڑی دھوپ میں کھڑا کر دیا تھا۔ اس کے بعد کبھی ہم نے ایسا کام نہیں کیا۔ زندگی نے جو سبق دیا تھا، وہ اپنے پلے باندھ کر میں آگے کو چلتی رہی، رکی نہیں۔ ہم کرائے کے مکان میں رہتے رہے اور مکان بھی بدلتے رہے، پھر ایسا ہوا کہ اپنا گھر خدا کے فضل و کرم سے بنا لیا۔ اس میں جہاں کچھ تعاون آپی کا تھا، وہیں بھائی کی طرف سے بھی مدد شامل تھی۔ ہمارے ابو جتنا کر سکتے تھے وہ کر رہے تھے۔ میری زندگی کا سفر بھی رخصتی کے بعد رکا نہیں تھا۔ میں جو زندگی بھر مشاہدہ کرتی آئی تھی، میں نے اپنی ساس، سسر اور نند کے ساتھ دیور کو بھی پرکھ لیا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میرے ساتھ روایتی ساس بہو جیسے معاملات پیش آئیں گے۔ شادی کے پہلے روز کے بعد سے ہی میرے لئے حالات نے کروٹ لینی شروع کر دی تھی۔ میں کچھ بھی ایسا ویسا نہیں کرنا چاہ رہی تھی جس کی وجہ سے میرا گھر ابتدائی ایام میں ہی بربادی کی بنیاد رکھتا۔

انگلینڈ سے آپی کی آمد پر ملنے کی ضد نے نہ صرف فراز بلکہ میری ساس کو بھی قدرے پریشان کر دیا تھا۔ میں اپنی بے بسی پر رو دی تھی کہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ شادی کے بعد جب میں کہیں جانے کے لئے بیوٹی پارلر گئی، وہاں پر میری میک اپ آرٹسٹ کے ساتھ بات چیت کو جس طرح سے میری نندوں نے رائی کا پہاڑ بنا لیا تھا۔

اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس طرح سے پرسکون رہنا مشکل ہوگا۔ میں ایک طرف اپنے وعدے پر قائم تھی، جس کی وجہ سے مجھے اپنے گھر کو بچاؤ کے لئے اقدامات کرنا ضروری تھے لیکن دوسری طرف میری ساس بھی شروع کے دنوں کے بعد سے بدلنا شروع ہو گئی تھیں۔ انہوں نے روایتی ساس بننا شروع کر دیا تھا۔

میرے تمام تر کاموں پر نکتہ چینی کرنا ان کا دل پسند مشغلہ بنا گیا تھا۔

میں جتنی اچھی کھانے کی اشیاء بناتی، ان کو اس

میں کوئی نہ کوئی نقص نظر آجاتا تھا، انہوں نے مہمانوں کے سامنے بھی مجھے کچھ نہ کچھ کڑوی باتیں سنانا اپنا مقصد بنالیا تھا جس کی وجہ سے میں اندر ہی اندر سے ٹوٹ رہی تھی۔ میں سچ بتاؤں تو اپنے شوہر کی کم عقلی یا سمجھداری کی بدولت خود کو تمام تر حالات کا ذمہ دار بنا رہی تھی۔ میرے خیال میں کسی اور کی غلطی اس قدر نہ تھی جو کہ میں نے اپنے لئے تسلیم کر کے حالات کو سدھارنے کی کوشش شروع کی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف نندوں نے بھی لگائی بجھائی کر رکھی تھی۔ میرا بھائی جب ملنے کے لئے آیا تو میری نند نے میرے حوالے سے بات منفی انداز میں کی تو بھائی نے فوراً سے جواب دے دیا تھا کہ آپ کی طرف سے بھی کچھ ہوتا ہوگا تو ہی فرحت آپ کو آگے سے کچھ کہتی ہوگی۔

میری نند نے اس بات کو دل پر لے لیا تھا اور اس نے ساس کے کان بھرنا شروع کر دیئے تھے۔ ساس نے سسر کو بھی اپنی باتوں میں الجھا کر ان کو بھی میرے خلاف کر دیا تھا۔ تمام تر حالات اس رخ پر جا رہے تھے کہ میری اس گھر سے رخصتی کرائی جا سکے۔ مجھے آج تک علم نہیں ہو سکا ہے کہ جب میں ان کی پسند سے وہاں گئی تھی تو پھر میرے خلاف اس قدر سب کیوں ہو گئے تھے۔ کیا میں اس قدر بھی حق نہیں رکھتی تھی کہ میں اپنی خواہشات کو پورا کر سکوں۔ کیا یہ ضروری تھا کہ میں اپنے آپ کو مار کر اپنی ساس اور باقی افراد کو خوش کروں؟ کیا میں ایک لڑکی اپنے آپ کے لئے کوئی بات کہہ نہیں سکتی، آخر ایک عورت ہی عورت کی دشمن کیوں بن جاتی ہے، اپنی بیٹی کے لئے جو ساس سوچتی ہے وہ بہو کے لئے کیوں نہیں ہوتا ہے؟ فراز نے اپنی ناسمجھداری کی بدولت میرے لئے بھی مسائل کھڑے کر دیئے تھے اگرچہ انہوں نے کئی مرتبہ محبت کا اظہار کیا تھا، وہ میرے لئے سب کرنے کے لئے تیار ہوتے تھے مگر اپنی والدہ اور بہنوں کے دباؤ پر میرا کھل کر ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔ جس دن ہماری کسی بات پر ساس نے لڑائی شروع کی تھی تو انہوں نے ہمیں گھر سے باہر نکل کر الگ ہو جانے کا بھی کہہ دیا تھا جس پر وہ عمل نہ کر سکے تھے۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میں نے گندم میں زہر رکھوایا تھا کہ سب مر جائیں۔ جس سے مجھے اپنے شوہر کے ساتھ زندگی خوشگوار رہنے کا موقع مل سکے۔

اسی لڑائی کے دوران ہی میں ساس نے مجھے زیوارت اور دو لاکھ روپے جو رکھنے کو دیئے تھے۔ اس پر بھی باتیں سنانی شروع کر دی تھیں کہ میں وہ پیسے پلاٹ خریدنے میں خرچ کرنا چاہ رہی تھی مگر انہوں نے اس پر بھی خوب لے دے کی تھی جس پر یہ معاملہ بھی ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔

میری زندگی میں شروع سے ہی احساس کمتری موجود تھی جو کہ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی۔ میں نے اپنی والدہ کو بھی روز روز کی لڑائی کے حوالے سے اعتماد میں لیتے ہوئے بتا دیا تھا۔ انہوں نے بھی ساس کے ساتھ معاملات کو حل کرنے کی کوشش کی مگر ان کے بھی کان پر جوں تک نہ رینگی۔ پھر جب کسی بات پر ہماری آپس میں لڑائی ہوئی تو میں نے ان کی بیٹیوں کے حوالے سے چند باتیں کیں تو وہ ذرا سہم سی گئی کہ اگر وہ اچھال دی جاتی تو پھر ان کی بھی اچھی خاصی سبکی ہو سکتی تھی۔ میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا، میں نے تو بس ان کو تلخ حقیقت بیان کر دی تھی۔

میری شروع سے ہی عادت ہے کہ میں دل میں کوئی بھی بات نہیں رکھتی ہوں اور صاف بات کر دیتی ہوں۔ جھوٹ کم بولتی ہوں، مگر جب بول دوں تو پھر حالات کا بھی سامنا کر لیتی ہوں۔ میری اسی عادت نے ہی جب ساس نے زیورات مانگے تو میں بول دیا کہ امی کے گھر رکھوائے ہیں، جبکہ وہاں نہیں تھے، میری بات پر لڑائی حد سے بڑھی تو میں اپنے میکے آ گئی۔

میری سہیلی عاصمہ کو طلاق ہو چکی تھی۔

اُس کو علم تھا کہ اگر مجھے طلاق ہوئی تو کیا صورت حال ہوگی۔

اُس نے مجھے تمام ہونے والے مسائل اور پھر حل بتا کر راضی کر لیا کہ گھر کے ٹوٹنے سے اچھا ہے کہ میں واپس چلی جاؤں۔ اُس کے بعد نورین بھی خلع لے چکی تھی اُس نے بھی میری کھچائی کی تو مجھے ہوش آ گیا پھر میں نہ چاہتے ہوئے بھی سسرال آ گئی تھی۔

میرے گھر کی طرف سے بھی دباؤ تھا کہ میں نہ جاؤں مگر میں خود ہی بیگ لئے واپس آ گئی تھی۔

اُس کے چھے ماہ بعد ساس کا انتقال ہو گیا۔

میری نندوں کو اپنے شوہروں کی جانب سے مسائل ہوئے تو وہ میری طرف آنے سے ہی گریزاں ہو چکی تھیں۔ میرے شوہر کو بھی والدہ کے جانے کے بعد قدر ہونے لگی تھی۔

میری زندگی کے رنگ پھر سے نمایاں ہونے لگے ہیں۔

میں نے یہ سوچا کہ اگر میری زندگی میں نورین اور عاصمہ جیسے لوگ نہ ہوتے تو میرا گھر برباد ہو جاتا۔ اُس دن سے آج تک میں روز سجدہ شکر ادا کرتی ہوں کہ اُس نے بروقت میری رہنمائی کروائی کہ آج میں پھر سے گھر میں خوش و خرم ہوں۔

☆ ☆ ☆

تبصرہ

نام کتاب: خواتین ادب: تاریخ وتنقید
مصنفہ: ڈاکٹر صالحہ صدیقی
سن اشاعت: 2022
صفحات :1016 قیمت:500
ملنے کا پتہ: ضیائے حق
فاؤنڈیشن پبلشنگ ہاؤس، پریاگراج، یوپی
(موبائل: 9899972265)
مبصر: ضیاءالعظیم، پٹنہ
(موبائل:8936871233)

ڈاکٹر صالحہ صدیقی ادب کے افق پر ایک ابھرتا ہوا نام ہے۔ان کی دلچسپی کے موضوعات میں تنوع ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ادب کی کئی جہتوں سے خدمت انجام دے رہی ہیں۔ان کی تازہ تصنیف ''خواتین ادب: تاریخ وتنقید'' کی اشاعت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے ''ضیائے حق فاؤنڈیشن پبلشنگ ہاؤس، پریاگراج نے بڑے اہتمام سے کی ہے۔کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جس میں نثری، غیر نثری، شعری، تنقیدی، تحقیقی اور دیگر اصنافِ ادب کی خواتین قلمکاروں کی خدمات کے حوالے سے ڈاکٹر صالحہ صدیقی کے اکتالیس مضامین شامل ہیں۔جن میں سے بیشتر مضامین ملک و بیرون ملک کے مختلف رسائل و جرائد کی زینت بن چکے ہیں۔

''خواتین ادب: تاریخ وتنقید'' کو دیکھ کر مصنفہ کی محنت وکاوش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کتنی خوش اسلوبی سے اردو ادب کی تمام خواتین کی تاریخ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا ہے۔ ہمارے ادب کے فروغ میں خواتین کا بہت اہم رول رہا ہے نذر سجاد حیدر یلدرم اور حجاب امتیاز علی سے لے کر ذکیہ مشہدی تک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ان خواتین فنکاروں کی خدمات کو ہمارے محققین و ناقدین ہمیشہ نظر انداز کرتے آئے ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ اُردو ادب میں بہت کم وقت میں اپنی قابلیت کا اعتراف کرانے والی ڈاکٹر صالحہ صدیقی نے اس گوشے کی تشنگی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر صالحہ صدیقی کی تحریروں میں جہاں موضوعات کا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے، وہیں اس سے ان کی انفرادیت اور موضوعاتی ہمہ گیری کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ان کے یہاں اظہار مدعا کا سلیقہ بھی جا بہ جا نظر آتا ہے۔کم عمر ہونے کے باوجود ان کے یہاں تجربات ومشاہدات کی ایک کائنات جمع ہے، جہاں الفاظ کا رکھ رکھاؤ، جملوں کو برتنے کا ڈھنگ، تعبیرات کے استعمال کا طریقہ ایک پختہ قلم کار کی طرح نظر آتا ہے۔وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں، اس کو خوش اسلوبی سے انجام تک بغیر کسی رکاوٹ اور ہچکچاہٹ کے پہنچا کر ہی دم لیتی ہیں، چاہے وہ موضوع کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو۔اس کا مشاہدان کی زیر نظر کتاب ''خواتین ادب: تاریخ وتنقید'' بھی ہے۔اس سے قبل مختلف اصنافِ سخن پر ان کی تحریریں تواتر کے ساتھ اردو روزناموں اور رسائل ومجلّات میں شائع ہو کر قارئین سے داد وتحسین حاصل کرتی رہی ہیں۔اب تک ان کی نصف درجن تصنیفات منظر عام پر آ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔جن میں سے کئی کتابوں پر انھیں اعزاز بھی حاصل ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر صالحہ صدیقی نے زیر نظر کتاب ''خواتین ادب: تاریخ وتنقید'' کی تصنیف کر کے اور ادب کا تانیثی پہلو سے جائزہ لے کر کے انفرادیت کا حامل کام کیا ہے۔ان کی اس کوشش سے ادب میں feminism کے مختلف جہات کو سمجھنے میں مدد ملے گی کیوں کہ انھوں نے اُردو میں اسے ایک مختلف زاویے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سے قبل ان کی کتاب ''اردو ادب میں تانیثیت کی مختلف جہتیں'' شائع ہو کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ خواتین ادب کی تعریف وتوصیف اور اس کے جائزے پر مشتمل ان کی تازہ کتاب ''خواتین ادب: تاریخ وتنقید'' بھی اردو میں ایک دستاویزی اہمیت کی حامل سمجھی جائے گی۔اس لیے کہ ان کی یہ تصنیف اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے، جس میں کئی نئے موضوعات کو چھونے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر صالحہ صدیقی نے اپنی اس کتاب ''خواتین ادب: تاریخ وتنقید'' میں خواتین کی نثری، غیر نثری اور شعری جہات کا احاطہ کیا ہے۔اس تصنیف میں بہت ہی سلیقے سے خواتین ادب سے متعلق موضوعات کو تاریخی و تنقیدی نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ معروف نقاد حقانی القاسمی نے اس کتاب کو ''خواتین کا انسائیکلو پیڈیا'' قرار دیا ہے۔اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب عام قارئین کے ساتھ ساتھ خواتین کی خدمات کے حوالے سے کام کرنے والے ناقدین کے لیے بے حد ضروری کتاب ہے خصوصاً اردو ادب کے طلبہ وطالبات کے لئے ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔

☆☆☆

محترمی ومکرمی! آداب وتسلیمات

ادبی نشیمن (جلد 5، شمارہ 03) کے اول وآخر سرورق کی پشت پر ندیم صدیقی نے آنجہانی گوپی چند نارنگ پر جو مضمون سپردِ قلم کیا ہے، اس میں سورگباسی شخصیت کے محاسن اور اردو ادب میں ان کے کنٹری بیوشن کے تعریفی وتوصیفی پہلوؤں کو ہائی لائٹ کیا گیا ہے۔ جبکہ ان کی ذات سے اردو کو پہنچنے والے ناقابل تلافی نقصانات کا کوئی ذکر نہیں۔ اردو ادب میں ان کی "مافیائی" حیثیت پر وہ ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکے جو کہ بے حد ضروری تھا۔ دراصل ہم سب انصاف کو نصف منفی اور نصف مثبت کرتے ہوئے مکاری سے باز نہیں آتے۔

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کے پروفیسران سے فقیر کے دوستانہ اور بے تکلفانہ مراسم ہیں۔ ذاتی گفتگو میں وہ سب اس حقیقت کے معترف ہیں کہ گوپی جی نے سیاسی اثر ورسوخ اور منسٹری آف ایچ آر ڈی کو سنبھالنے والے نوکر شاہوں کے دم پر اردو پریوار کو اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔ چپراسی سے لے کر ریڈر اور ڈین تک سب کچھ ان کی مرضی سے طے ہوتا تھا۔ سرکاری اداروں کی مختلف کمیٹیوں میں کس کو کون سا عہدہ ملنا ہے، یہ سب نارنگ ہی طے کرتے تھے۔ ساہتیہ اکادمی اردو کے لیے کس کو انعام دے گی، یہ بھی گوپی جی ہی طے کرتے تھے۔

بھارت کی تمام یونیورسٹیوں کے شعبہائے اردو کو تنہا "گاڈ فادر" کی طرح کنٹرول کرتے ہوئے انھوں نے باصلاحیت لوگوں کو دیوار سے لگا دیا اور صرف ان کے خوشامدی جمہوروں کی چوبارہ ہوئی۔ وہ ایسے نااہل افراد کے لیے ڈھال بن گئے، جنھوں نے اردو کی ریسرچ سے وابستہ طالبات کا استحصال کیا اور جب کسی طالبہ نے شخصیت کا نام لے کر محکمہ جاتی کارروائی کی درخواست کی تو جانچ کے لئے تشکیل کردہ تحقیقاتی کمیٹی پر دباؤ ڈال کر ملزم پروفیسران کو اوپر سے نیچے تک بچانے کے لیے اس مداری نے اپنی کرتب بازی سے سورج کی طرح روشن حقائق پر جھوٹ کی سیاہی انڈیل دی۔

یہ موقع ہے کہ ہم سلام پیش کریں مرحوم پروفیسر عنوان چشتی (جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی) کو جنھوں نے ہر طرح کا خطرہ اٹھا کر نارنگ کو بے نقاب کرنے میں پہل کی اور اس "گندھ" کی نشاندہی کی جو تمام یونیورسٹیوں کے شعبہائے اردو میں آج بھی بجبجا رہی ہے۔

ہر چند کہ نارنگ نے ساہتیہ اکادمی کے چیئرمین کے عہدہ کے لیے موزوں ترین و معزز شخصیت "مہاشویتا دیوی" کو ہرا کر قبضہ کر لیا۔ مگر جس دادگیری کے چلتے ہوئے "الیکشن" کا ڈرامہ ہوا تھا، اس کی چرچا اس وقت بڑے اخباروں میں بھی ہوئی تھی۔

۱۹۹۰ کے آس پاس قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سمیت کئی سرکاری اداروں نے اردو کا انسائیکلوپیڈیا ترتیب دیا۔ جس میں گوپی چند نارنگ کو چالیس سے زائد کتابوں کا خالق بتایا گیا۔ مگر پٹنہ والے صفدر امام قادری نے اس جعلسازی کا پردہ فاش کر دیا اور بتایا کہ نارنگ نے ڈاکٹریٹ کے لیے جو ریسرچ کی تھی، اس کے علاوہ کوئی دوسری کتاب نہیں لکھی۔ نارنگ نے اپنے کھاتے میں مختلف سرکاری اکادمیوں میں پڑھے گئے ریسرچ پیپرس کو جمع کر کے ایک تقریظ لکھ ماری اور بطور مصنف مضامین کے مجموعہ پر مشتمل کتاب کو اپنی تخلیق بتا دیا۔ یہی حال "ساختیات" پر لکھی گئی کتاب کا بھی ہوا۔ معلوم چلا کہ وہ انگریزی کی کتاب کا ترجمہ ہے، موصوف کی تخلیق نہیں۔ عمران بھنڈر والا نے اس پر خوب کام کیا ہے۔

ان تمام اوصاف کے علاوہ موصوف کی "دادگیری" کا عالم یہ تھا کہ ۱۹۹۷ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام "اکبر الٰہ آبادی: فن اور شخصیت" کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں، جب اسٹیج پر پروفیسر سید عقیل رضوی، پروفیسر جعفر رضا، شمس الرحمن فاروقی اور پروفیسر علی احمد فاطمی سمیت دو درجن سے زائد اردو کے مصلحت پرست دانشور اکبر الٰہ آبادی کا گن گان کر رہے تھے، اس وقت گوپی چند نارنگ نے تمام Pseudo دانشوروں کی باٹ لگاتے ہوئے اکبر الٰہ آبادی کو انگریزوں کا تنخواہ دار ایجنٹ، جاسوس اور قوم کا غدار قرار دے دیا۔ لیکن اسٹیج پر براجمان شخصیتوں نے یا سامعین میں سے کسی نے "چوں" کہ آواز تک نہیں نکالی۔ سیمینار ختم ہونے کے بعد فقیر نے پروفیسر سید عقیل رضوی اور شمس الرحمن فاروقی سے پوچھا کہ ایسی زبردست "دُھلائی" کے بعد آپ لوگ خاموش کیوں رہے۔ تو ہر دو حضرات نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ۱۹۷۴ تا ۱۹۷۶ کے درمیان میں دہلی میں مقیم تھا۔ اس دوران غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام خدائے سخن میر تقی میر پر ایک سیمینار منعقد ہوا، جس کے کرتا دھرتا گوپی چند نارنگ تھے۔ سیمینار کا افتتاح مرکزی وزیر ضیاء الرحمن انصاری نے کیا اور جب انھوں نے میر تقی میر پر تقریر کرتے ہوئے دو مرتبہ میر دردؔ کے اشعار پڑھے تو صف اول میں بیٹھے ہوئے باقر مہدی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور ضیاء الرحمن انصاری کو انگلی دکھا کر تنبیہاً بولے کہ "محترم! آپ صرف تقریر کریں گے۔۔۔۔۔ کوئی شعر نہیں پڑھیں گے"۔ سارا مجمع سن رہ گیا اور گوپی چند نارنگ بوکھلاہٹ میں کبھی ضیاء الرحمن انصاری کو سنبھالتے تو کبھی باقر مہدی کے ہاتھ جوڑتے۔ انتہائی بدمزگی کے عالم میں مہمانِ خصوصی نے راہِ فرار اختیار کی اور سیمینار کا بنٹا دھار ہو گیا۔

مذکورہ واقعہ بتانے کی وجہ یہ تھی کہ عقیل رضوی اور فاروقی میں وہ "فائر" نہیں تھا جو ایک حقیقی دانشور کی پہچان بن جاتا ہے۔ بڑے سے بڑے "مافیا" کی گردن پکڑ کر رگڑ دیتا ہے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والوں میں

میری اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ قارئینِ ادبی نشیمن تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیں۔ میں اپنے ہم وطن ندیم صدیقی صاحب کی شعری اور صحافتی صلاحیتوں کا قائل ہوں، وہ میری اس تحریر کو ادروائز نہ لیں۔ شکریہ

قائد حسین کوثر (کانپور)
موبائل: 8840940733
9455582714


سخن شناسی
(تنقیدی مضامین)
مصنف
ڈاکٹر مقبول احمد مقبول
مرتب
محمد عظمت الحق
محاکمہ
(تجزیے، تبصرے، دیباچے)
مصنف
ڈاکٹر مقبول احمد مقبول
تحقیق و ترتیب
محمد عظمت الحق
مجموعۂ نعت
قندیل
ہندی گورکھپوری
افقِ ادب کا نیرِ تاباں
ترتیب و تدوین
مصباح انصاری
سہمی سلگتی تعبیریں
افسانے
ڈاکٹر جاوید حسین پاوجی شارب
بیگم رقیہ
ایک اعتباری شخصیت
ترتیب و تقدیم
ڈاکٹر اسلم جمشید پوری
ریاضِ عروض
ڈاکٹر اختر ریاض
امیر خسرو شخصیت، فکر و فن اور تصوف
ذاکر حسین ذاکر
ISSN 2348-1129
UGC CARE LISTED JOURNAL
ثالث
شوکت حیات مدیر

Vol: 5, Issue: 04
Sep. to Nov.2022

Urdu Quarterly
Adabee Nasheman
Lucknow - 226003

RNI No. UPURDU /2017/74845
Per Copy : 25/-
Biannaul Subscription :300/-

دستاویز

امیر الدولہ پبلک لائبریری



محمود آباد کے راجہ نواب علی خاں کے ولی عہد امیر حسن خاں نے 1868ء میں ایک پبلک لائبریری کی سنگِ بنیاد رکھی ۔ نواب علی خاں کے انتقال کے بعد جب امیر حسن خاں جاگیر کے ولی عہد مقرر ہوئے تو انھیں "امیر الدولہ" کے لقب سے نوازا گیا۔ آگے چل کر اسی لائبریری کا نام "امیر الدولہ پبلک لائبریری" پڑا۔ جس جگہ پر اس لائبریری کی سنگِ بنیاد رکھی گئی تھی اس جگہ کو کچھ شرائط اور رقم کے عوض میں انگریزی حکومت کو منتقل کر دیا گیا تھا، اس کے بعد 1907ء میں یہ لائبریری لال بارہ دری میں اور 1910ء میں چھوٹی چھتر منزل میں "پبلک لائبریری" کے نام سے قائم ہوئی۔ 1921ء میں ہرکورٹ بٹلر نے قیصر باغ میں بارہ دری کے قریب پبلک لائبریری کی دوبارہ بنیاد رکھی جو 1926ء سے آج تک "امیر الدولہ پبلک لائبریری" کے نام سے معروف ہے۔

امیر الدولہ پبلک لائبریری میں راجہ محمود آباد اور بہت سے تعلقہ داروں نے کتابیں عطیہ کیں۔ اس کتب خانے میں مختلف موضوعات پر دو سے ڈھائی لاکھ کتابیں موجود ہیں۔ اس میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی، سنسکرت، پالی اور ہندی کے علاوہ دیگر کئی زبانوں میں بے حد نایاب کتابیں، دستاویزات اور قلمی نسخے موجود ہیں۔ ان نسخوں میں سودا کا دیوان اور امانت علی کی اندر سبھا اور منشی امام بخش بیدار کی "تاریخِ سعادت" بھی شامل ہے۔ "تاریخِ سعادت" ایک منظوم فارسی تاریخ ہے جو عہدِ نواب سعادت علی خاں (۱۷۹۸ء۔ ۱۸۱۴ء) کے لئے بہترین ماخذ ہے خصوصاً شہر لکھنؤ کا ایک مستند مرقع بھی ہے۔

افسوس کہ موبائل کے اس دَور میں مستفدین کی تعداد میں تیزی سے کمی واقع ہوئی ہے۔ اب ریسرچ اسکالر اور کچھ پرانے اردو کے شوقین ہی یہاں آتے ہیں۔ تیزی سے بدلتے ہوئے ماحول کے پیشِ نظر لائبریری میں موجود نادر و نایاب کتابوں کو ڈیجیٹلائز کیا جا رہا ہے اور طلبہ کو ای لائبریری اور وائی فائی کی سہولیات فراہم کی جا رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ لائبریری میں سول سروسز کے امتحانات کی تیاری کرنے والے طلبہ کے لئے مخصوص جگہ متعین ہے، جہاں پر لائبریری کا اسٹاف ان کی پوری مدد کرتا ہے۔

امیر الدولہ پبلک لائبریری کا شمار اتر پردیش کے قدیم ترین کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ اس لئے ضلع انتظامیہ نے اس پر اچھا خاصا بجٹ صرف کرنے کا اعلان کیا ہے لیکن لائبریری کے مخدوش حالات کو دیکھ کر یہ اعلان فقط کاغذوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ دبستانِ اردو ہونے کی وجہ سے لکھنؤ میں نجی کتب خانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ لیکن نجی کتب خانوں تک عوام کی رسائی نہیں ہو پاتی اس لئے ان کی صحیح تعداد کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ٹائمس آف انڈیا کی ایک رپورٹ کے مطابق "پدماوت" کا اصل نسخہ بھی چوک کے کسی نجی کتب خانے میں موجود ہے۔ اس طرح کے کئی قیمتی نسخے امیر الدولہ پبلک لائبریری میں موجود ہیں جسے زمانے کی دست برد سے بچائے رکھنے کے لئے واضح منصوبہ بندی کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے، کیونکہ یہ نایاب وراثت اہلِ اردو کے لئے بیش قیمت تحفہ ہے۔

Printed,Published & Prop. By AhmadRashiq at Nomani Press, Baroodkhana,Golaganj, Lucknow
and Published at 544C/168,Almas bagh,Hardoi Road,Lucknow
Editor: Dr. Saleem Ahmad